دبستانِ عظیم آباد

سلطان آزاد

فہرست

- مشعلِ فردا دبستانِ عظیم آباد ۸
- دیباچہ ۹
- عرضِ حال ۱۵
- دبستانِ عظیم آباد، ماضی کے آئینے میں ۱۸
- **حصّہ اوّل** (منظومات)
- شاہ قائم چشتی نظامی قتیلؔ ۴۵
- عبدالمنّان بیدلؔ ۴۶
- کاظم حسین نثارؔ ۴۸
- حمیدؔ عظیم آبادی ۴۹
- شمس الدین شمسؔ منیری ۵۱
- ثاقبؔ عظیم آبادی ۵۲
- شاہ غلام حسنین گلؔ ۵۳
- افضلؔ عظیم آبادی ۵۴
- نوابزادہ سید محمد مہدیؔ ۵۵
- بدرالدین احمد بدرؔ ۵۶
- مظہرؔ عظیم آبادی ۵۸
- شاہ صبیح الحق صبیحؔ ۵۹
- بسملؔ عظیم آبادی ۶۰
- وفاؔ عظیم آبادی ۶۱
- بگٹٹؔ عظیم عظیم آبادی ۶۲
- عطاؔ کاکوی ۶۳
- مخزنؔ عظیم آبادی ۶۴
- جمیلؔ مظہری ۶۴
- عبدالمجید شمسؔ عظیم آبادی ۶۶
- بشن نرائن لال ماتھر رنگینؔ ۶۸
- شرفؔ عظیم آبادی ۶۹
- محمود علی خاں صباؔ ۷۰
- فلسفیؔ عظیم آبادی ۷۱
- رعناؔ عظیم آبادی ۷۲
- شمسؔ نوری ۷۳
- رامیشور پرساد گلوارا ۷۴
- بیخودؔ عظیم آبادی ۷۵
- ضمیرؔ پھلواروی ۷۶
- پرویزؔ شاہدی ۷۷
- جوہرؔ فریادی ۷۹
- سید حسن سرمدؔ ۷۹
- بہاءالدین احمد کلیمؔ ۸۰
- اعجاز حسین جاویدؔ ۸۲

تعلیم کی تکمیل مولوی حبیب صاحب مرحوم کے ہاتھوں ہوئی۔ ادب کا شوق بچپن سے تھا۔ اس ذوق کا آغاز نیم ادبی رسائل سے ہوا۔ لیکن ان کی تحریروں میں تنقید اور تحقیق کے جراثیم بے حد نمایاں ہیں۔ "ہندوستان کی مقبول ترین زبان اردو" "اردو اور سیاست"، "عوام کا پسندیدہ شاعر۔ ساحر لدھیانوی"، "سہیل عظیم آبادی اور چار چہرے" وغیرہ مضامین سے ان کی ذہنی بصیرت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ "سہیل عظیم آبادی اور چار چہرے" سے یہ اقتباس دیکھئے!

"افسوس ان قلمکاروں پر ہے جو سہیل عظیم آبادی کو پریم چند کا پیرو بتا کر ان کی فنی عظمت پر پریم چند کی چھاپ لگا کر تہہ خاک کر دینا چاہتے ہیں۔ کاش! وہ یہ جان پاتے کہ سہیل عظیم آبادی نہ تو پریم چند کے پیرو تھے اور نہ ہی دوسروں کے کیوں کہ ادب میں پیروی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ پریم چند اسکول سے ہرگز وابستہ نہیں تھے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ پریم چند ان سے پیشتر کے فنکار ہیں لہٰذا ان کے افسانوں کو انھوں نے پڑھا ہے۔ اور کچھ افسانے جو دیہاتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، پریم چند کی طرح انھوں نے بھی لکھے۔ اور وہ اس لئے کہ وہ خود بہار کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ وہاں کی زندگی اور حالات سے بخوبی واقف تھے۔ اگر اردو ادب کا فنکار سہیل عظیم آبادی کو پریم چند اسکول سے وابستہ سمجھتا ہے تو اس کی بھول ہے۔"

تحریر کی یہی کاٹ، سوچنے کا یہی انداز سلطان آزاد کی نمایاں خوبی ہے۔ مقالہ "ہندوستان کی مقبول ترین زبان اردو" میں مزید مواد شامل کر کے کتابچہ "ہند کی شیریں زباں اردو" انھوں نے شائع کرایا ہے۔ اپنی ادبی زندگی کے سفر میں سلطان آزاد نے تکنیکی، سیاسی، مذہبی اور ادبی (تحقیقی و تنقیدی) مضامین لکھے ہیں۔ انشائیہ، طنز و مزاح اور افسانے لکھے ہیں۔ ڈرامہ، رپورتاژ اور فیچر کے علاوہ بچوں کی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ اور عام معلومات پر بھی ذوق آزمائی

کے علاوہ جدید و قدیم طرز کی غزلوں پر ذوق آزمائی کی ہے۔ جو شاعر صبیح لو، شاہراہ، بیسویں صدی وغیرہ رسائل اور جرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس کے علاوہ اکثر نظمیں اور غزلیں مختلف ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوتی رہتی ہیں۔ آج کل طنز و مزاح پر بھی طبع آزمائی کر رہے ہیں، جس کے تحت کچھ تخلیقات جریدہ مگدھ پنچ اور ماہنامہ شگوفہ میں شائع ہوئی ہیں۔ آپ کے پسندیدہ شعراء داد بار بالترتیب نظیر، انیس، غالب، اقبال، شاد، جوش، پروین شاہدی، جمیل مظہری، زار، فیض، رضا نقوی واہی، احتشام حسین اور سہیل عظیم آبادی وغیرہ ہیں۔ آپ کی تصنیف "شعلۂ تشنگی" منظرِ عام پر آچکی ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

تشنگی ہم بجھانے کو جائیں کہاں — ریت کی لہر میں ہے سمندر نہاں
آس کا اڑ کے جائے تو پنچھی کہاں — ہر دشا کو پسیٹے ہوئے ہے دھواں
لفظ و معنیٰ کے چکر میں ہم آ گئے — کھا گئے ہم فریبِ زباں و بیاں
میں ہوں جھوٹا کہ جھوٹا ہے یہ آئینہ — کل جو اس میں تھا میں آج میں وہ کہاں

شکایتِ ستم و جورِ یار کر نہ سکے — خلافِ وضع کبھی وضعدار کر نہ سکے
جو اپنے غم کو غمِ روزگار کر نہ سکے — وہ سرپرستیِ لیل و نہار کر نہ سکے

صبا شیر

اطہر شیر نام، صبا تخلص، موضع محسن پور ضلع پٹنہ کے رہنے والے اور متوسط طبقہ کے زمیندار خاندان سے تعلق تھا۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ سنہ ۱۹۴۶ء میں مدرسہ مزیدیہ بہار شریف سے

عالم کا امتحان امتیازی نمبر سے پاس کیا اور ۱۹۵۵ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے عربی اور ۱۹۵۷ء اور ۱۹۶۰ء میں بہار یونیورسٹی سے اردو، فارسی میں ایم۔ اے کیا۔ تینوں مضامین میں اوّل درجے سے کامیاب ہوئے اور یونیورسٹی سے طلائی تمغہ بھی حاصل کیا۔ تین سال تک کالج میں لکچرر رہے۔ پھر بہار تعلیمی سروس میں داخل ہو کر خدا بخش مشرقی کتب خانہ میں بہ حیثیت فہرست ساز پانچ سال تک کام کرتے رہے۔ ۱۹۶۶ء سے اسی کتب خانہ میں درجہ اوّل میں مددگار ڈائریکٹر کے عہدہ پر فائز ہو کر کام کرتے رہے۔

آپ کو شاعری اور افسانہ نگاری کا شوق ۱۹۴۴ء سے ہوا۔ آپ کی غزلیں مقتدر رسالوں میں چھپی ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

امنگوں کے رنگیں اشاروں سے کھیلا
جوانی کے پر شور دھاروں سے کھیلا

عجب شوقِ منزل کی رنگینیاں تھیں
کہ میں پُر خطر رہگذاروں سے کھیلا

مرے سوزِ غم کی کہانی ہے اتنی
کہ الفت کے اُٹھتے شراروں سے کھیلا

امیدوں کا مدفن بنانے چلا ہوں
ہمیشہ میں جن کے سہاروں سے کھیلا

رکی جا کے منجدھار میں اپنی کشتی
عجب کھیل میں نے کناروں سے کھیلا

انیس عظیم آبادی

انیس امام نام، انیس تخلص۔ اپنے وطن عظیم آباد میں ۳۱ جنوری ۱۹۳۱ء کو پیدا ہوئے۔ پٹنہ یونیورسٹی سے ۱۹۵۳ء میں ایم۔ اے

کر لینے کے بعد دوسرے ہی سال مہاراجہ کالج آرہ میں اردو کے لکچرر مقرر ہوئے اچھے شاعر کی حیثیت سے اردو دنیا میں مشہور ہیں شہر دار در سن منکار نوحہ گر میرا پانی کا مقدمہ جیسی ان کی قدرِ اول کی نظمیں اردو کے شعری ادب میں بیش قیمت اضافہ ہیں۔ سوز و گداز، جوش و خروش، تردیِ بیان، سادگی و صفائی اور شدید اثر آفرینی آپ کی نظموں کے نمایاں اوصاف ہیں "برگِ صفا" کے نام سے آپ کا مجموعۂ کلام ۱۹۶۸ء میں زیرِ ترتیب تھا۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

شکم پہ باندھ کے پتھر بلا سے رہ جاتے — یہ خودکشی تو گوارا کبھی نہ کرتے ہم
وہی کہ جس نے مسلح کیا غنیموں کو — اسی سے پھر یہ گذارش کہ اک نگاہ کرم

ملا یہ فلسفۂ زندگی کسی سے ہمیں — ضمیر دانۂ گندم کے سامنے ہے حقیر
اندھیری رات جو ہوتی تو ہم سمجھ پاتے — مگر یہ دن کے اجالے میں اور یہ تفسیر

ڈاکٹر ممتاز احمد

ڈاکٹر ممتاز احمد۔ سکونت شہر پٹنہ (عظیم آباد) محلہ تری پولیا۔ عمر تخمیناً پچاس سال۔ ان دنوں پٹنہ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو کے عہدہ پر فائز ہیں۔

اردو شعرا کا تنقیدی شعور، مثنویاتِ راسخ، مکاتیب شہباز اور حدیثِ فن آپ کی مشہور تصنیفات ہیں۔ موصوف کو نثر اور شاعری دونوں پر عبور حاصل ہے۔ نمونۂ کلام میں آپ ایک نظم بعنوان "معذرت" ملاحظہ ہو۔

ہم نے ہر گام پہ احباب پہ تکیہ رکھا — ہم کو ہر گام پہ احباب کا انعام ملا

چند چہرے کہ جو ہر لمحہ مرے دل میں رہے
جن کے وعدے تھے بڑے، دعوے بڑے، بول بڑے

میں سمجھتا تھا کہ طوفانِ حوادث میں یہی
کون ڈھونڈے گا چراغِ رخِ زیبا لے کر

کشتیِ نوح کی مانند سہارا دیں گے
کیوں کہ اجداد کے احباب بھی اس غول میں ہیں

زہرِ غم کے لیے تریاق بن جائیں گے
سب کو ڈر ہے کہیں مل جائیں نہ انکے احباب

تیرگی زیست کی زرینی میں ڈھل جائیگی
اپنے احباب سے بے نور گلستاں میں جدا

درد دل ٹھہرے گا آہنگ بدل جائے گا
اپنی جنت کو لئے اپنے گلستاں میں مگن

دیدۂ تر سے ترنم کی لہر پھوٹے گی
یہ حقیقت ہے تو اے دوست مجھے کیا شکوہ

لیکن اے دوست تو احباب کا انعام نہ پوچھ
ابنِ آدم کی روایت ہے تو پھر کیا شکوہ

اس طرح سے مرے احباب بنے ناطہ توڑا
ابنِ آدم تو میں خود بھی ہوں مرے دوست بھی ہیں

جیسے زنجیر کی کڑیوں کو بکھیرے کوئی
کیا پتا مجھ سے بھی احباب کو کچھ شکوہ ہو

جیسے پنچھڑیاں گلابوں سے جدا ہو جائیں
اسی شکوہ نے انھیں بخشا ہو یہ طرزِ عمل

جیسے دریا کہ سمندر سے کنارا کر لے
اسی احساس کا انجام ہو یہ طرزِ گراں

اس طرح سے مرے احباب کے رخ کا دھارا
جو مری روح میں کانٹوں کی طرح چبھتا ہے

مجھ سے منھ موڑ کے بہنے لگا دھیرے دھیرے
جو مری زیست کو اک زہر بنا دیتا ہے

اور میں کاندھوں پہ خود اپنی صلیبوں کو لئے
کس کو ہمت ہے کہ خود ذات سے اپنی پوچھے

زیست کے زہر کو پیتا رہا دھیرے دھیرے
کون سا کس کا عمل کس کو سزا دیتا ہے

ہڈیاں جلتی رہیں سوزِ نہاں سے میری
کون سا کس کا قدم کس سے جدا کرتا ہے

میرے اذہان پہ افکار کی اک ضرب لگی
کون سی بات سے آئینے میں بال آتا ہے

میرے اعصاب، رگِ ساز تمنا ٹوٹے
کس کی مژگاں سے بدل جاتا ہے آنچل کا چلن

میری رگ رگ میں جلن بھرنے لگی دل بکھرا
کس عبارت سے بدل جاتی ہے دل کی تحریر

میرا دل سنبھل نہیں جو کہ بکھر کر سمٹے
کس اشارت سے بدل جاتے ہیں منزل کے نقوش

میرے احباب کہاں ہیں انھیں ڈھونڈھ کے کوئی
کتنی باریک سی نازک سی ہے قندیلِ وفا

کون کہہ سکتا ہے اس راہِ وفا میں اس سے
کیوں نہ شکووں کے عوض شکر کا سجدہ کر لوں

ٹیڑھی میڑھی نہ ہوئی ہوگی وفا کی تحریر
کیوں نہ احباب کو سینے سے لگا لوں بڑھ کر

اور دھندلا نہ گئی ہوگی ضیاء کی تنویر
اس لئے اب مرا دل مجھ کو صدا دیتا ہے

اس لئے میں کسے مجرم کہوں کس کو بخشوں
کہ میں احباب کا شکوہ نہ کروں شکر کروں!

کیوں نہ خود جرم خود آگاہ کا اقرار کروں
کہ میں احباب کا شکوہ نہ کروں شکر کروں!

اختر عظیم آبادی

محمد اختر حسین نام، اختر تخلص ابن محمد عظیم الدین کی پیدائش ۱۹ دسمبر ۱۹۳۳ء کو باغ کالوخاں پٹنہ سٹی میں ہوئی۔ موصوف کی علمی لیاقت آئی۔ اے ہے۔ ان دنوں سرکاری ملازمت میں ہیں۔ اختر عظیم آبادی کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۵۳ء سے ہوتا ہے۔ شعر گوئی میں جناب رمز عظیم آبادی سے مشورۂ سخن لیتے رہے ہیں۔ اصنافِ سخن میں زیادہ غزلیں کہی ہیں۔ جو مورچہ، ساتھی، راہ رو، بہار کی خزیں اور پرواز ادب جیسے جرائد و رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ پٹنہ ریڈیو سے بھی کئی کلام نشر ہوئے ہیں۔ آپ کے پسندیدہ شعراء جمیل مظہری، احمد فراز اور پروین شاہدی ہیں۔ جن کی فنی صلاحیت و عظمت سے کافی اثر قبول کیا ہے۔ آج کل پٹنہ سٹی میں سکونت پذیر ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

رئیسِ شہر کرائے کے گھر میں رہتا ہے
عمارتوں کا خدا اب کھنڈر میں رہتا ہے

وہ آشنا ہے نشیب و فرازِ موسم سے
جو آدمی کہ مسلسل سفر میں رہتا ہے

ہزار تیز ہوا ہو مگر بہ فیضِ جنوں
چراغ نقشِ قدم رہ گذر میں رہتا ہے

اچھال جام سبو لطفِ میکشی لے جا — یہ میکدہ ہے یہاں سے نہ تشنگی لے جا
عمل کی شکل بدل کیفِ زندگی لے جا — حیات ناز کرے ایسی بندگی لے جا
غموں کی دھوپ میں جلنے کی مجھکو عادت ہے — تجھے خوشی کی ضرورت ہے ہر خوشی لے جا

یوسف خورشیدی

محمد یوسف خورشیدی نام، یوسفؔ تخلص ابن محمد الیاس، اپنے وطن بہپورہ ضلع پٹنہ میں ۲۵ر دسمبر ۱۹۳۳ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کی علمی لیاقت ایم۔ اے، بی۔ ایل، پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی لٹ ہے۔ ان دنوں پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ریڈر کے عہدہ پر فائز ہیں۔

آپ کی ادبی زندگی کا آغاز کالج میں آنے کے بعد نظموں سے ہوا انھیں ادب میں جمیل مظہری اور اختر اورینوی جیسے استادوں سے تلمذ حاصل رہا ہے۔ اصنافِ سخن میں نظم اور غزل پر طبع آزمائی کی ہے۔ اور اس کے علاوہ نثر میں تنقیدی مضامین بھی لکھتے ہیں۔ جن میں شعری اور نثری دونوں تخلیقات آجکل، علی گڈھ میگزین، زبان و ادب، نقاد اور مہ نو جیسے رسائل اور دیگر اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ریڈیو سے بھی شعری اور نثری تخلیقات نشر ہوتی رہتی ہیں۔ آپ کی مطبوعہ تصنیفات "عظیم آباد کا ایک یادگار مشاعرہ" "نقشہائے رنگ رنگ" "پیشکش" اور "دیوانِ حامد" ہیں۔ پٹنہ کے مشہور اور قدیم رسالہ "معاصر" کی تمام تر ذمہ داری آپ کے سر ہے۔ فنّی طور پر آپ کے پسندیدہ شعراء غالب، اقبال، شاد اور جمیل مظہری ہیں۔ ان دنوں لیڈی

امام کمپاؤنڈ محلہ پتھر کی مسجد پٹنہ میں سکونت پذیر ہیں۔ نمونۂ کلام میں ان کی ایک نظم بعنوان "فریبِ سحر" ملاحظہ ہو۔

سن رہا ہوں گلستاں میں آگئی فصلِ بہار
غنچۂ پژمردۂ گلشن میں آئی زندگی
اور افق سے چھٹ گیا ناکامیوں کا اب غبار
آفتابِ صبحِ آزادی نکل آیا، مگر
نغمہ ساماں کیوں گلستاں میں نہیں ہوتے طیور
کیا فریبِ ظلمتِ شب ہے بعنوانِ سحر
کون کہتا ہے کہ ابھرا ہے افق سے آفتاب
کون کہتا ہے کہ آزادی کی پھوٹی ہے کرن
زندگی اب تک شبستانوں میں ہے سرمستِ خواب
رات دن کی محنتوں کا پھل وہی فاقہ کشی
ہے وہی طرزِ تمدن ہے وہی اس کا نظام
سازِ جمہوری میں ہے اب تک نوائے قیصری
زندگی کا راز کیا ہے؟ سجدۂ شام و سحر
ان خداوندوں کے آگے جن کے کاشانوں میں آج
جلتے ہیں دیپک غریبوں کے لہو سے سر بسر
زندگی کا راز کیا ہے؟ وقف کر دو زندگی
ان خداؤں کے لئے بخشی جنھوں نے ملک کو
مفلسی، درماندگی، افسردگی، بیچارگی
زندگی کا راز یہ؟ ہرگز نہیں ہرگز نہیں
زندگی کا راز تو احساسِ خودداری میں ہے

زندگی پابندیِ دار و رسن ہر گز نہیں
تو سمجھتا ہے اسے شاعر کا آوارہ خیال
رات کی تنہائیوں میں چاندنی کی چھاؤں میں
چپکے چپکے بن رہا ہوں جو حسیں خوابوں کا جال
حیف تو واقف نہیں ہے زندگی کے راز سے
تو نے سمجھا ہی نہیں اب تک تقاضائے حیات
دیکھ آتی ہے صدا یہ زندگی کے ساز سے
مژدہ اے اہلِ وطن آنے کو ہے اب انقلاب
ٹوٹنے ہی کو ہے اب سرمایہ داری کا طلسم
جھلملاتے ہیں ستارے آفتاب آنے کو ہے

سعید رضا گہر

سید سعید رضا نام، تخلص گہر ابن مولوی سید حسن رضا ثاقب مرحوم، مقام شاہ کی اٹلی، شہر عظیم آباد میں ۱۹۳۵ء کو پیدا ہوئے۔ موصوف کی علمی لیاقت ڈبل ایم۔ اے، ڈیپ ان ایڈ ہے۔

آپ کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۶ء سے غزل گو کی شکل میں ہوا۔ ابتدا میں اپنے کلام پر اپنے والدِ ماجد ثاقب عظیم آبادی سے صلاح و مشورہ لیا۔ اصنافِ سخن میں غزل، نظم، سلام، نعت، حمد، سہرا اور تہنیت پر طبع آزمائی کی ہے۔ جن میں مخصوص تخلیقات جرس، صبحِ نو اور حلقۂ ادب آرہ کے گلدستہ میں شائع ہوئی ہیں۔ آپ کے پسندیدہ شعراء فارسی میں حافظ، اردو میں غالب

اور پرویز شاہدی مرحوم ہیں۔ فی الحال آپ ایجوکیشن آفیسر کے عہدہ پر فائز ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے ؎

شمع ان کو خود تو پروانہ بنا سکتے نہیں
اس حقیقت کو ہم افسانہ بنا سکتے نہیں

لالہ و گل سے محبت والہانہ ہے مگر
ہم کسی گلشن کو ویرانہ بنا سکتے نہیں

ہوش پرور ہیں بہت انداز و ناز ان کے مگر
ہم سے فرزانے کو دیوانہ بنا سکتے نہیں

دعوتِ بادہ کشی جن نرگسی آنکھوں میں ہے
ہم انھیں آنکھوں کو پیمانہ بنا سکتے نہیں

ناز والے بھی نیازانہ ہیں مست مے مگر
ہم بھری محفل کو میخانہ بنا سکتے نہیں

ڈھونڈتی ہیں اجنبی چہرے کو نظریں اے ندیمؔ
جانے پہچانے کو جانانہ بنا سکتے نہیں

ندیمؔ عظیم آبادی

سید شاہ امین الرحمٰن نام، ندیمؔ تخلص خلف حافظ سید شاہ عبدالمنان۔ متوطن عظیم آباد، کشمیری کوٹھی۔ سالِ ولادت یکم جنوری ۱۹۳۶ء ہے۔ علمی لیاقت ایم۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی ہے۔ آپ ترکِ وطن کرکے ۱۹۵۶ء میں کراچی چلے گئے۔

حضرت ندیمؔ نہایت سنجیدہ انسان ہیں اور ان کی شعر گوئی کا مذاق پاکیزہ ہے۔ شاعری میں کسی سے مشورۂ سخن نہیں لیا۔ نمونہ کلام یہ ہے ؎

وارفتگیِ شوق مری زندگی میں ہے
اک لذتِ حیات تری بندگی میں ہے

ہاں یہ بھی ہے طریقۂ اظہارِ دلبری
اک التفاتِ یار اسی کجروی میں ہے

گو ہر کلی پہ ثبت ہے مہرِ خزاں تو کیا
رنگینیِ چمن اسی آزردگی میں ہے

ہنگامۂ مطرب کی وہ رنگینیاں نہ پوچھ
اک لطفِ انجمن اسی شوریدگی میں ہے
تاریکیٔ حیات سے گھبرا نہ اے ندیم
تابندگیِ صبح اسی تیرگی میں ہے

احمد تبسم

محمد احمد نام، تبسم تخلص ابن محمد سلیم، مغل سرائے میں یکم فروری سنہ ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوئے۔ آئی۔ اے تک پڑھنے کے بعد تعلیمی سلسلہ ترک کر دیا اور ملازمت کر لی۔

شعر و شاعری کی طرف عہدِ طفلی سے رجحان رہا۔ اس سلسلے میں اپنا کلام حمید عظیم آبادی کو دکھاتے تھے۔ اصنافِ سخن میں غزل زیادہ کہی ہیں۔ جو مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ریڈیو سے بھی آپ کا کلام برابر نشر ہوتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ مشاعروں میں بھی شرکت کرتے ہیں آپ لائیٹ میوزک کے فنکار بھی ہیں۔ فنی طور پر آپ کے پسندیدہ شعراء جمیل مظہری، شہریار اور احمد فراز ہیں۔ آج کل شہر عظیم آباد میں محلہ صدر گلی میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

یہ ذائقہ شناس لبوں کا قیاس ہے
اس کے لہو میں تازہ پھلوں کی مٹھاس ہے
اک محویت کی شام مرے آس پاس ہے
بیٹھا ہوں اور سامنے خالی گلاس ہے
آنکھوں کو ڈس رہی ہے دہکتی برہنگی
ماحول کا گداز بدن بے لباس ہے
کچھ روشنی میں غم کا اندھیرا ابھی گھول دے
اے شمعِ وقت تجھ سے یہی التماس ہے

یادوں کی میز پر کوئی تصویر چھوڑ دے
کب سے ہمارے ذہن کا کمرہ اداس ہے

کی ہے۔ ان دنوں دو تالیف "بہار میں اردو ظرافت" اور "بہار کے نعت گو شعرا" کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں۔

"دبستانِ عظیم آباد" میں سلطان آزاد نے جس دیدہ وری اور دور رسی سے کام لیا ہے اور جتنی محنت کی ہے۔ اس کا صلہ انھیں اس صورت میں ملے گا کہ تاریخِ ادب میں ان کا نام ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے گا۔ "دبستانِ عظیم آباد" کئی ابواب پر مشتمل ہے۔ منظومات اور منثورات کے حصے الگ الگ ہیں۔ منثورات میں مضمون نگار اور افسانہ نگار کو احاطہ کیا گیا ہے۔ مضمون نگاروں کی تعداد بارہ ہے۔ ان سبھوں کی سوانح کے ساتھ ان کے مضمون کے چند اقتباسات بھی شامل ہیں۔ جس کی شروعات قاضی عبدالودود سے ہوتی ہے۔ اسی طرح انیس[۱۹] افسانہ نگاروں کے تذکرے اور ان کے افسانوں کے اقتباسات سے ان کی شناخت کی گئی ہے۔ جس کی ابتدا محمد محسن (ماہر نفسیات) سے ہوتی ہے۔ حصۂ منظومات میں اناسی[۷۹] شعرا کو نمونۂ کلام کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ جس کے سرِ خیل قتیلؔ دانا پوری (۱۸۹۳ء) ہیں [illegible] کے آخر میں "اور دیگر......" کے تحت ان قلمکاروں کے نام دیئے گئے ہیں جو گمنام رہ کر ادبی ذوق کی آبیاری کرتے رہے ہیں۔ ان کے علاوہ ان نو آموز قلمکاروں کے اسما بھی دیئے گئے ہیں جن سے مستقبل میں ذرا بھی امیدیں وابستہ ہیں۔ لیکن اس کتاب کا ایک اہم باب "ابتدائی مقالہ" دبستان عظیم آباد ماضی کے آئینے میں" بھی ہے" جس میں ماضی کے وہ تمام واقعات مختصراً" جامع اور مدلل انداز میں قلمبند ہیں جو عظیم آباد کی عظمت کی دلیل ہیں۔ ۱۸ر اکتوبر ۱۹۰۲ء سے ۲۴ر اکتوبر تک مسلسل ہونے والے یادگار اور تاریخی مشاعرے کی تفصیل کے علاوہ دوسرے صوبہ و شہر سے عظیم آباد کی سرزمین پر آنے والے تخمیناً بیس[۲۰] شعرا کے نام اور عظیم آباد کی خاک میں پیدا ہونے والے اور شہر کے باشندہ تہتر[۷۳] قدیم شعرا کا

قمر زاہدی

قمرالحسن زاہدی نام، قمر تخلص ابن سید شمس الحسن زاہدی کی پیدائش شہر گیا میں ۲۶ راگست ۱۹۳۷ء کو ہوئی۔

آپ کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۸ء سے ہوا، ان دنوں زیادہ تر افسانے لکھتے تھے۔ لیکن شاعری کی طرف ۱۹۴۹ء سے رجحان پیدا ہوا۔ اصنافِ سخن میں غزل، نظم اور قطعہ پر طبع آزمائی کی ہے۔ جو حیات، سہیل، کاروان، ایثار، گفتگو، نئی منزل، عزائم، رباب، شمع، آواز، آجکل، صبحِ نو، ردبی اور زبان و ادب رسائل اور دیگر جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ غزلیں اور نظمیں ریڈیو سے بھی نشر ہوتی رہتی ہیں۔ ان کی ادبی خدمات نثر نگاری اور شعر و شاعری تک ہی محدود نہیں بلکہ اور پٹنہ کے مختلف اخبارات میں ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۶ء تک بطور سب ایڈیٹر کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ ان دنوں محکمۂ تعمیرات عامہ یعنی (P.W.D.) کے اکاؤنٹس سکشن میں زیر ملازمت ہیں۔ آپ کی مطبوعہ تصنیف (مجموعۂ کلام) "چشمِ نم" ہے، جو منظر عام پر آچکی ہے۔ آپ کے پسندیدہ شعراء و ادباء جگر، فیض، مجاز، پرویز شاہدی، میر، غالب، سودا، درد، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، بیدی اور منٹو ہیں۔

قمر صاحب آج کل شہر پٹنہ میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہیں۔

نمونۂ کلام یہ ہے ؎

پھینک دیتے ہیں شکستہ جب کوئی شیشہ ہوا　　ہم سنبھالے پھرتے ہیں اک آئینہ ٹوٹا ہوا

بے حجابانہ خیالوں میں چلے آتے ہو کیوں
کیسے ہو پردہ نشیں یہ بھی کوئی پردا ہوا

اہلِ منصب، اہلِ زر سے دور رہنا چاہئے
سر پہ سورج آگیا، سایہ بہت چھوٹا ہوا

ہم تو غم سے بے نیازانہ گذر جاتے مگر
ان کی چشمِ نم سے اپنے غم کا اندازہ ہوا

جورِ عشق میں بھٹکے نہیں ہشیار نہیں
ہم کو وہ راہ نہ بتلا کہ جو دشوار نہیں

لے کے لوٹ آئے اسے مصر کے بازار میں ہم
دل وہ یوسف کہ کوئی جس کا خریدار نہیں

کیفؔ عظیم آبادی

محمد یٰسین نام، کیفؔ تخلص، ابن عبدالغفور، سکونت محلہ شاہ گنج پٹنہ۔ ۱۹۳۷ء کو شہر عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔

موصوف نے ۱۹۵۴ء میں انجمن ترقی اردو بہار کے زیر اہتمام پٹنہ کے ایک مشاعرہ میں جناب کشن پرساد کول، جگن ناتھ آزاد، پرویز شاہدی اور عرش ملسیانی کے سامنے اپنے تعارف کے لئے یہ شعر پڑھا تھا۔

کبھی صبح و شام نالہ، کبھی شکوۂ زمانہ
کبھی جستجوئے روزی، کبھی عشق کا فسانہ

آپ اپنے کلام پر استاد شاعر رمزؔ عظیم آبادی سے برابر مشورۂ سخن لیا کرتے ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

ڈس چلیں جب میرے دل کو خود مری تنہائیاں
شہرِ غم میں بج اٹھی ہیں دور تک شہنائیاں

پھول نغمہ چاند تارے جام، صہبا، چاندنی
اک تبسم آپ کا اور سیکڑوں رعنائیاں

دے دیئے پھولوں کو کتنے پیلے پیلے پیرہن
معجزے سے کم نہیں ہیں خاک کی انگڑائیاں

اس قدر مانوس تنہائی نہ خود کو کیجئے — چین سے رہنے نہ دیں گی یادوں کی پرچھائیاں
پھر چلی بادِ بہاری پھر ہوئی صبحِ جنوں — پھر وہی کوئے ملامت پھر وہی رسوائیاں

مختار احمد عاصی

مختار احمد نام، عاصی تخلص، ابن محمد عباس کی پیدائش ۲ر فروری ۱۹۳۸ء کو داناپور کینٹ ضلع پٹنہ میں ہوئی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد جی این کالج میں داخلہ لیا لیکن کچھ مجبوریوں کے تحت تعلیم کو خیرباد کہنا پڑا۔ اس کے بعد محکمہ بہار اسٹیٹ روڈ ٹرانسپورٹ میں نوکری کرلی۔ آج کل اسسٹنٹ ٹرافک انسپکٹر کے عہدہ پر فائز ہیں۔ دورانِ تعلیم بچوں کے لئے کہانیاں لکھنے کا شوق رہا۔ لیکن بعد میں شاعری کی طرف آگئے۔ اور اس سلسلے میں سریر کابرمینائی اور صائم سیدن پوری سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے رہے۔ استادوں کی شفقت اور توجہ سے آپ شاعری کے اسرار و کنایات سے اچھی طرح واقف ہوگئے۔

عاصی نے اصناف سخن میں نظم، غزل اور قطعہ پر طبع آزمائی کی ہے جو سہیل، آہنگ، بیسویں صدی، مفاہیم، صبح نو، زبور اور دیگر جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

"حیات دوام"۔ "تثلیث فن"۔ اور "سنبل و شبنم" آپ کی مطبوعہ تصنیفات ہیں۔ "تثلیث فن" پر بہار اردو اکادمی نے انعام سے نوازا ہے۔ فنی طور پر آپ کے پسندیدہ شعراء و ادباء ساحر، قتیل، غیاث احمد گدی، واجدہ تبسم، شہریار، اور قمر رئیس وغیرہ ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے:

گلشن میں جو گلشن کے پرستار اٹھے ہیں — صیاد سے وہ برسرِ پیکار اٹھے ہیں

جو تیری محبت کے طلب گار اٹھے ہیں
دنیا سے وہ ٹکرانے کو تیار اٹھے ہیں

میخانے کو ساقی نہ اجڑنے کبھی دیں گے
اب سر سے کفن باندھ کے میخوار اٹھے ہیں

پیمانہ بکف تھے جو کبھی بزمِ جہاں میں
ہاتھوں میں لئے اب وہی تلوار اٹھے ہیں

کتنے ہیں جو پی کر بھی نہیں بیخود و سرشار
ہم بے پیے میخانہ سے سرشار اٹھے ہیں

اب سبزۂ بے گانہ کہاں اپنے وطن میں
پھولوں کی حفاظت کیلئے میخوار اٹھے ہیں

ظہیر صدیقی

محمد ظہیر الدین صدیقی اصلی نام، ظہیر صدیقی قلمی نام اور ظہیر تخلص ابن مولانا سمیع الدین صدیقی مرحوم، سکونت محلہ قطب الدین پٹنہ ہے۔ آپ کی پیدائش ۸ر فروری ۱۹۳۶ء کو بہنول (ضلع رہتاس) میں ہوئی۔

باضابطہ طور پر آپ کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۶۱ء سے غزل کی صورت میں ہوا، جو "شاعر" بمبئی کے مارچ ۱۹۶۲ء کے شمارہ میں شائع ہوئی۔ شعر و سخن کے علاوہ آپ کے کئی تنقیدی مضامین اور تبصرے ریڈیو کے کئی اسٹیشنوں سے نشر ہوتے رہے ہیں اور اس کے علاوہ بیشتر نظمیں اور غزلیں ہند و پاک کے تقریباً ہر قابل ذکر رسائل مثلاً "نقوش" لاہور" اوراق" لاہور۔ سیپ، افکار، نقش بجائزہ (کراچی) عصری آگہی، شاعر، شب خون، کتاب، آہنگ (ہند) اور لندن سے نکلنے والا ماہنامہ "آفاق" میں شائع ہو چکی ہیں۔ آپ کی مطبوعہ تصنیف "ماسوا" شعری مجموعہ ہے، جو منظر عام پر آ چکی ہے۔ شعر و شاعری میں آپ استاد اور شاگرد کے متعلق صدر امریکہ ابراہم لنکن کے قول کی پیروی

کرتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ نہ آپ کسی کے شاگرد ہیں اور نہ آپ کا کوئی شاگرد ۔ آپ کے پسندیدہ شاعر غالب ہیں۔ اس کے علاوہ ہر شاعر کی اچھی شاعری آپ کی پسند ہے۔ فی الحال ان دنوں جیون بیمہ کارپوریشن پٹنہ میں زیر ملازمت ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے: ؎

جو حوصلہ ہو تو ہلکی ہے دوپہر کی دھوپ — تنک مزاجوں کو لگتی ہے لو، قمر کی دھوپ
خدا کے واسطے وا کردے روزنِ مژگاں — ہمارے دل میں بھی اترے تری نظر کی دھوپ
شب وصال کی یہ شام بھی ہے رشکِ سحر — سہاگ مہک کے سرکتی ہے بام و در کی دھوپ

ندی کے تٹ پہ ٹھہرایا گیا ہوں — مگر قطروں کو ترسایا گیا ہوں
چبھو کر خار سسکایا گیا ہوں — دکھا کر پھول بہلایا گیا ہوں
سرابوں کے تعاقب میں ازل سے — بیاباں ریگستاں میں دوڑایا گیا ہوں

سحر عظیم آبادی

سید صغیر احمد حمیدی نام، سحر تخلص، ابن سید عبدالحمید متخلص بہ حمید عظیم آبادی ۹ ر دسمبر ۱۹۴۰ء کو شہر عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ کمسنی میں ہی ترکِ وطن کرکے اپنے خاندان کے ساتھ مغربی پاکستان چلے گئے۔

آپ نے فارسی تعلیم اپنے والدِ محترم سے حاصل کی۔ بعد ازاں اپنے بڑے بھائی سید مبارک حسین سرور کے زیرِ نگرانی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے منجھلے بھائی حسن حمیدی کی صحبت سے مستفید ہوتے رہے۔ شعر گوئی سے دلچسپی عنفوانِ شباب ہی سے ہے۔ شاعری میں اپنے والد ماجد سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے: ؎

کیوں فضا بھی الم بداماں ہے
آج کیا ہے جو دل پریشاں ہے

گل بھی گلشن میں دستِ حرماں ہے
ہائے کیسا انقلابِ دوراں ہے

اک تماشا سی بن گئی ہے حیات
اپنا سایہ بھی اب گریزاں ہے

ذکرِ صبحِ بہار، ارے توبہ!!
ہر کلی جب خزاں بداماں ہے

اک تم ہی نہیں سحرؔ مضطر
دیکھئے جس کو وہ پریشاں ہے

طلحہ رضوی برقؔ

سید شاہ محمد طلحہ رضوی نام، برقؔ تخلص، داناپور پٹنہ وطن مالوف ہے۔ آپ کے والد ماجد عظیم صوفی بزرگ حضرت سید شاہ محمد قائم رضوی قتیلؔ ہیں۔ ۱۹۴۰ء میں تولد ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنی والدہ کی آغوش اور والد کے سایۂ عاطفت میں پائی۔ ۱۹۵۵ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۶۳ء میں اردو اور فارسی میں ایم۔ اے کیا۔ اس کے بعد پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی لٹ بھی کیا۔ آج کل ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹس اردو و پرشین، جین کالج آرہ میں ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

نگاہوں میں پنہاں سخن سنجیاں ہیں
محبت میں پیدا غلط فہمیاں ہیں

تخیل کی رشکِ ارم وادیاں ہیں
تصور کی خوش کن طرحداریاں ہیں

جوانی کی اللہ ری پرکیف ادائیں
جدھر دیکھئے طرفہ رنگینیاں ہیں

وہ نرگس سی آنکھیں گلابی شرابی
بھری مدھ سے پوری کی پیالیاں ہیں

وہ لب جن پہ دل خوں ہوا اہلِ ہمن کا
شفق جن میں گم وہ دل آویزیاں ہیں

تراب حسین فردوسی

سید تراب حسین نام، فردوسی تخلص ابن سید کاظم حسین زار، سکونت دولی گھاٹ پٹنہ سیٹی ہے۔ فردوسی عظیم آبادی کی پیدائش عظیم آباد میں ۲۱ر جنوری ۱۹۴۱ء کو ہوئی۔ آپ کا ماحول بچپن سے ہی ادبی رہا۔ کیونکہ آپ کے والد ماجد اپنے وقت کے ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ جب تک وہ زندہ رہے ان ہی سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ شعر و سخن کے اصناف میں غزل، نظم، رباعی، قصیدہ اور مرثیہ وغیرہ پر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن عام شاعروں کی طرح غزل کی طرف زیادہ توجہ دی۔ آپ کے مخصوص کلام صبحِ نو، آج کل اور دیگر رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ریڈیو سے بھی غزلیں نشر ہوئی ہیں ان دنوں سرکاری ہیلتھ ورکشاپ گلزار باغ میں اسٹور کیپر ہیں۔ آپ کے پسندیدہ شعراء جن سے آپ نے اثر قبول کیا ہے ان میں میر تقی میر، غالب، ساحر لدھیانوی، جوش ملیح آبادی اور فانی بدایونی ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

پھر یاد کوئی آیا پھر درد سوا ہوگا — اب اے غمِ تنہائی اس رات کا کیا ہوگا
کچھ اور بڑھی ہوگی سُرخی ترے چہرے کی — تنہائی میں جب تو نے کچھ یاد کیا ہوگا
ماتھے پہ شکن کیسی شرمائے ہوئے کیوں ہو — لوگوں نے مجھے شاید دیوانہ کیا ہوگا
میخانہ چھٹا مجھ سے پی آتو ہی اب واعظ — اب بھی مرے حصّے کا پیمانہ بھرا ہوگا

تم نے تو مری حالت مڑ کر بھی نہیں دیکھی
کیا جانو خدا حافظ کس دل سے کہا ہوگا

شکیب ایاز

شکیب ایاز ابن عظیم الدین مخمور، ۱۲ر جولائی ۱۹۴۱ء کو پٹنہ سیٹی میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں ساغر تخلص کیا۔ بعد میں شکیب ایاز کے نام سے مشہور ہوئے آپ کی علمی لیاقت بی۔ اے (آنرس اردو)، ایم۔ اے (اردو) اور گولڈ میڈلسٹ (پٹنہ یونیورسٹی) ہے۔ ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۵۱ء سے ہوا۔ جب آپ نے سلسلہ انجمن رفیق الشعراء کی جانب سے ہونے والے مشاعرہ میں شرکت کی۔ اصناف سخن میں جناب ثاقب عظیم آبادی سے صلاح و مشورہ لیا۔ شعر و شاعری میں غزل اور نظم کہی ہیں۔ لیکن غزل کی طرف زیادہ رجحان رہا ہے۔ ریڈیو سے آپ کے کلام اور دوسروں کی کتابوں پر تبصرے نشر ہوتے رہتے ہیں۔ آپ کی تصنیف "برعکس" (شعری مجموعہ) بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے زیر طبع ہے۔ اگست ۱۹۷۵ء سے مارچ ۱۹۷۶ء تک آل انڈیا ریڈیو رانچی میں اردو پروگرام ایگزیکٹو رہ چکے ہیں۔ وہاں سے استعفیٰ کے بعد ان دنوں اورینٹل کالج پٹنہ سیٹی میں لکچرر کے عہدہ پر فائز ہیں۔ آپ کے پسندیدہ شعراء اردو ادبا بالترتیب ہیں: میر، غالب، نظیر، شاد، جمیل مظہری، فراق، ناصر کاظمی، بیدی، منٹو، اختر اورینوی، قرۃ العین حیدر کے علاوہ ناقدوں میں حالی، امداد، اثر، شبلی، شہباز اور کلیم الدین احمد ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے: ؎

دل کو کیسا روگ لگا ہے، تم بھی چپ اور ہم بھی چپ
سارا عالم پوچھ رہا ہے، تم بھی چپ اور ہم بھی چپ۔
سربستہ رازوں کی صورت دل میں زخم چھپائے ہیں..
یہ بھی اک جینے کی ادا ہے، تم بھی چپ اور ہم بھی چپ

کرب کی آگ میں جلتا رہا تنہا کوئی
سیکڑوں ابر سیہ اٹھے نہ برسا کوئی

شام ہوتے ہی مرے ذہن کی دیواروں پر
پھیل جاتا ہے تری یاد کا سایا کوئی

دل کے دروازے پہ ہر لمحہ ابھرتی آہٹ
کہہ رہی ہے مرے احساس سے آیا کوئی

متین عمادی

متین الحق نام، متین تخلص ابن حضرت مولانا سید شاہ بہیج الحق عمادی قدس سرہٗ سکونت خانقاہ عمادیہ، عظیم آباد۔ آپ کی پیدائش ۲۸ فروری ۱۹۴۲ء کو خانقاہ عمادیہ منگل تالاب، عظیم آباد میں ہوئی۔

موصوف کی علمی لیاقت ایم۔ اے (فارسی اور اردو) ہے۔ آپ کی ادبی زندگی کا آغاز حصولِ تعلیم کے دوران ہوا چوں کہ آپ کے والد خود شاعر تھے۔ اس لئے ابتدا میں انھیں سے صلاح و مشورہ لیا۔ اصناف سخن میں نعت، سلام، مرثیہ، قطعہ، نظم اور غزل پر طبع آزمائی کی لیکن غزل سے زیادہ لگاؤ رہا۔ آپ کی زیادہ تر غزلیں نیا دور، زبان و ادب اور بانو جیسے معیاری رسائل کے علاوہ کچھ ہفتہ وار اخباروں میں بھی شائع ہوئی ہیں اور اس کے ماسوا آپ کی غزلیں ریڈیو سے بھی برابر نشر ہوتی رہی ہیں۔ آپ نے اپنے والد ماجد کا مجموعۂ کلام "نقوشِ صبح" مرتب کیا ہے۔ جو منظرِ عام پر آچکا ہے۔ فیض، احمد ندیم قاسمی، ساحر اور جمیل مظہری آپ کے پسندیدہ شعراء ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے:۔

اپنے شعروں میں متین اپنا ہی پیکر رکھئے
رہئے جس شہر میں اس شہر کا منظر رکھئے

قلب میں پہنے گداز دل آزر رکھئے
انگلیاں تب کسی پتھر کے جگر پر رکھئے

ترے سوال کا جو میں جواب بن جاتا
یقین ہے کہ نیا اک نصاب بن جاتا

ورق ورق مرے حرفوں میں ڈوبتا کوئی جسے وہ پڑھتا میں ایسی کتاب بن جاتا

کاظم ہاشمی

کاظم ہاشمی نام، کاظم تخلص، ابن ایس ایم قاسمی، ماہ جون ۱۹۴۲ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کی پرورش ایسی ماں کی گود میں ہوئی جن کی زندگی زاہدانہ اور عارفانہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو اولیاء کرام سے کافی عقیدت ہے اس کا ثبوت آپ کا تحقیقی مقالہ بعنوان "حضرت آسی: ایک صوفی شاعر" ہے جس پر پی۔ ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔

یوں آپ کی ادبی زندگی کا آغاز بچپن سے ہی ہوتا ہے۔ جب آپ نے مضمون اور کہانی لکھنا شروع کیا۔ پھر اس کے بعد شاعری کی طرف توجہ دی اصناف شاعری کے علاوہ نثر میں بھی آپ کی کئی خدمات ہیں۔ جو اکثر و بیشتر ریڈیو سے نشر ہوتے رہے ہیں۔ مشاعرہ سے بھی آپ کو کافی دلچسپی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۸ء تک پٹنہ میں اے جی بہار کی جانب سے ہونے والے مشاعرہ میں پیش پیش رہے ہیں اور پھر مارواڑی کالج کشن گنج میں بھی مشاعرہ کی بنیاد ڈالی۔ جہاں ان دنوں آپ شعبۂ اردو میں اردو لکچرر کے عہدہ پر فائز ہیں۔ "تصوف کے نغمات سرمدی" اور "مطالعۂ آسی" آپ کی مطبوعہ تصنیفات ہیں۔ صادق پور، عظیم آباد آپ کا مسکن ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے: ؎

سب ہوئے کنارہ کش جب سے کی وفا میں نے زندگی سے پایا ہے حرف بے صدا میں نے
دوست مجھ سے برہم ہیں غیر مجھ سے آزردہ اس کو کون بتلائے کی ہے کیا خطا میں نے

ذکر بالترتیب سنہ ۱۱۶۱ھ تا سنہ ۱۳۱۱ھ مع نمونۂ اشعار شامل ہے۔ ساتھ ہی اکیس (۲۱) قدیم نثر نگاروں کے تذکرے بھی دیئے گئے ہیں۔ سلطان آزاد کی زبان تعبیری اور متضمن (Connotative) ہے اور ان میں تاریخی حادثے' یادیں اور روابط ہیں۔ اظہار اس کا اہم پہلو ہے۔ اور یہ اظہار صرف فنکاروں کی ذات تک محدود نہیں بلکہ قومی مزاج اور تاریخی عوامل سے جڑے ہوئے ہیں۔

سلطان آزاد کی یہ تحقیقی کتاب 'احاطۂ عہد اور وسعتِ مضامین کے لحاظ سے بڑا کارنامہ ہے۔ انھوں نے دبستانِ عظیم آباد کے ماضی' حال اور مستقبل کے قلمکاروں کو جس طرح روشنی عطا کی ہے' اس سے استفادہ ہر حال میں کیا جائے گا اور یہ کتاب مشعلِ راہ ثابت ہوگی !

مناظر عاشق ہرگانوی
مارواڑی کالج بھاگل پور
(بہار)

رات کا اندھیرا ابھی آج ہم سے روٹھا ہے — اک شمع جلانے کی پائی ہے سزا میں نے
دیکھو تو زمانے کا آج کیسا تیور ہے — کاٹ لی زباں میری جب بھی سچ کہا میں نے

رشید عارف

عبدالرشید نام، عارف تخلص ابن عبدالحمید مرحوم، سکونت لودی کٹرہ پٹنہ سٹی ہے۔ آپ کی پیدائش لودی کٹرہ پٹنہ سٹی میں ۸ر دسمبر ۱۹۴۲ء کو ہوئی۔ علمی لیاقت بی۔ اے ہے۔ باضابطہ طور پر آپ کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۶۰ء سے ہوا۔ ابتدا میں آپ نے اپنے کلام پر مرحوم ثاقب عظیم آبادی سے مشورۂ سخن لیا۔ اصناف سخن میں غزل، نظم، رباعی، قطعہ، قصیدہ اور نعت پر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن غزل زیادہ کہی ہے۔ آپ کی تخلیقات صبحِ نو، ادب نکھار، آج کل، کھلونا، زبان و ادب، گلِ نو، نسرین، اور المجیب میں شائع ہوئی ہیں۔ اور اس کے ماسوا ریڈیو سے بھی ان کی غزلیں برابر نشر ہوتی رہی ہیں۔ آپ کے پسندیدہ شعرا غالب، اقبال، مومن، ساحر، شمیم جے پوری اور ناصر کاظمی ہیں۔ فی الحال ان دنوں آپ محکمۂ مالیات بہار میں زیرِ ملازمت ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

مزید حوصلے بڑھتے ہیں اس مسافر کے — کہ جس کی راہ میں کانٹے بچھائے جاتے ہیں
اجڑ گئی مری دنیا تو کچھ ملال نہیں — ہے فکر تم کہیں رسوا نہ ہو زمانے میں
بچھڑ کے ان سے تو زندہ ضرور ہوں لیکن — یہ قیدِ عمر مسلسل سزا لگے ہے مجھے
ایک تجھ پر ہی جہاں بھر میں یہ احساں کیوں ہے — مجھ سے مانوس تو اتنا غمِ دوراں کیوں ہے
لالہ و گل پہ تو کچھ میرا بھی حق ہے لیکن — میرے حصے میں فقط خارِ بیاباں کیوں ہے

معین کوثر

معین الدین نام، کوثر تخلص ابن جناب امیر حسن مرحوم، سکونت محلہ باغ پاتو پٹنہ سٹی، ۶ر اپریل ۱۹۴۳ء کو شہر عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ علمی لیاقت میٹرک ہے۔ باضابطہ طور پر آپ کی ادبی زندگی کا آغاز مئی ۱۹۶۱ء سے ہوا۔ اپنے کلام پر مشہور شاعر رمزؔ عظیم آبادی سے اصلاح لی ہے۔ اصنافِ سخن میں غزل، نظم، نعت، قطعہ اور رباعی پر طبع آزمائی ہے۔ لیکن روایتی شاعروں کی طرح غزلیں زیادہ کہی ہیں۔ جن میں زیادہ تر غزلیں آجکل، بیسویں صدی، تحریک، جبین، انیس ادب، صبح نو اور زبان وادب وغیرہ میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ چند غزلیں ریڈیو سے بھی نشر ہو چکی ہیں آپ کی مطبوعہ تصنیف (شعری مجموعہ) "حرفِ تمنا" ہے۔ آپ کے پسندیدہ شاعر صرف شادؔ عظیم آبادی ہیں۔ علمی صلاحیت اور ذہنی تربیت میں آپ کے استاد ناؔصر زیدی صاحب کا بھی بڑا حصہ ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

ماضی کے اندھے درپن میں اپنا عکس گنوائے کون
جن شہروں کی گلیاں سونی ان شہروں میں جائے کون

ہم بیتاب بہت ہیں لیکن اپنی عزت اپنے ہاتھ
ان کی بزمِ طرب میں جاکر سنگِ ملامت کھائے کون

اے افسردہ رہنے والے تو نے کیا دیکھا نہیں
شہر میں ایسی بھی گلیاں ہیں جہاں پہرا نہیں

ڈھونڈتے ہیں ہر طرف ہاتھوں میں پتھر لے کے لوگ
ان دنوں دیوانہ کوئی شہر میں ملتا نہیں

شمیم فاروقی

شمیم فاروقی نام، شمیم تخلص ابن سید محمد فاروق کی پیدائش ۲۵ دسمبر ۱۹۴۳ء کو ہوئی۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایم۔ اے (اردو) تک تعلیم پائی۔

آپ کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۶۰ء سے ہوا۔ اصنافِ سخن میں لاشعوری طور پر غالب سے متاثر رہے۔ اور شروع میں دو سال تک شفا گوالیاری سے اصلاحیں لیں۔ اب تک آپ کے کلام کتاب، شب خون، تحریک، شمع، روبی، شیرازہ، تناظر، زبان و ادب اور آہنگ وغیرہ رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں سے فیچر، غزل اور گیت نشر ہوتے رہے ہیں۔ فنی اعتبار سے غالب، میر، فانی، جمیل مظہری اور صدیق مجیبی آپ کے پسندیدہ شعراء ہیں۔ آپ کی غزلوں کا مجموعہ بنام "ذائقہ میرے لہو کا" عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ فی الحال پٹنہ میں ہی قیام پذیر ہیں کیوں کہ آپ آل انڈیا ریڈیو پٹنہ اردو پروگرام کے پروگرام ایکزیکیوٹیو ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

شکایت مری غیر سے کس لئے — اگر میں برا ہوں تو مجھ سے کہے
دعا دے رہی ہے یہ سوکھی ندی — ترے خشک ہونٹوں کو دریا ملے

ہمراہ چل رہا تھا مگر دیکھتا نہ تھا
جیسے کہ وہ کبھی کا مرا آشنا نہ تھا
سارے بدن پہ آگ کی لپٹیں سوار تھیں
دریا میں کود نے کے سوا راستہ نہ تھا

شہلا نگار شمسی

شہلا نگار شمسی نام، تخلص شہلا، بنت انعام اللہ کی پیدائش ۱۶ جولائی ۱۹۵۴ء کو ہوئی۔ آپ کی تعلیمی لیاقت ایم۔ اے ہے۔

شہلا صاحبہ کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۷۴ء سے ہوا۔ جب ان کی پہلی نظم 'روبی' میں شائع ہوئی تھی۔ اصنافِ سخن میں غزلیں اور نظمیں کہتی ہیں۔ جواب تک بیسویں صدی، فروغِ ادب، زبان و ادب، تحریک، بانو، انتخاب اور گلفشاں میں شائع ہوئی ہیں۔ شعر و شاعری کے علاوہ کہانیاں اور مضامین بھی لکھتی ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ شہر پٹنہ میں اپنے بھائی ڈاکٹر جمشید عالم کے ہمراہ سکونت پذیر ہیں نمونۂ کلام یہ ہے۔

تمھارے پیار کا دامن کھنچا کھنچا سا ہے
مرے سکون کا آنگن گھٹا گھٹا سا ہے
تمام ریت کے گھر کس نے توڑ پھوڑ دیے
اگرچہ درد کا طوفاں رکا رکا سا ہے
مرے خلوص کی آنکھوں میں رشک ہے لیکن
ترے غرور کا شعلہ بجھا بجھا سا ہے

(حصہ دوم)

منشورات

مضمون نگار

قاضی عبدالودود

قاضی عبدالودود ابن قاضی عبدالوحید المعروف بہ وحید عظیم آبادی، مسکن عظیم آباد۔ آپ کی پیدائش کاکو (جہان آباد) میں ۱۸۹۴ء کو ننہال میں ہوئی۔

قاضی صاحب بہار کے وہ شخص ہیں، جنہوں نے یورپ کی بہترین درسگاہوں سے اقتصادیات اور قانون کی تعلیم حاصل کی۔ بہار کی سیاسی زندگی میں راجندر پرساد کے شانہ بشانہ کام کیا۔ کیمبرج میں صدر جمہوریہ ہند فخرالدین علی احمد مرحوم اور نورالدین احمد مرحوم کے رفیق جلیس رہے۔

موصوف کی ادبی زندگی کا آغاز چودہ سال کی عمر سے دورانِ تعلیم میں ہوا۔ شعر درج ہیں ایک دو سو اشعار کہے لیکن ان میں زیادہ تر منظر عام پر نہ آسکے۔ آپ اردو ادب کی ایک بڑی شخصیت ہیں۔ تحقیق آپ کا خاص موضوع ہے۔ علم اور مطالعہ کے علاوہ صاحبانِ علم و فن کی نظر میں ان کی ان تحقیقات کا پایہ بلند ہے۔ ان کی وجہ سے اکثر اردو تحقیق کے سرمایہ کو جو قدر وسیع اور اس کے معیار کو جتنا بلند کیا جائے۔ اس کی مثال کسی دوسرے کے یہاں نہیں ملتی ہے۔ اور اسی اعتبار سے دنیا قاضی عبدالودود کو اردو ادب کے ایک عظیم محقق کی حیثیت سے جانتی ہے۔ ان کی شخصیت کے دوسرے پہلو یا تو سرے سے تاریکی میں ہیں یا پھر بہت کم روشنی میں آئے ہیں۔ آپ کی مرتب کردہ کتابیں تذکرۂ شعرا مصنفہ ابن طوفان، قطعات داد آرزو، دیوان جوشش، قاطع برہان و رسائل متعلقہ وغیرہ اپنی ایک حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کے مضامین بھی اردو ادب کا ایک گرانقدر سرمایہ ہیں۔ نمونہ تخلیق

میں آپ کی ایک مختصر تخلیق بعنوان "گلدستہ شعرا پٹنہ" یہ ہے :-

محمد اکبر خاں، جری حاجی پوری جو شیدا (نوروز علی خاں لکھنوی تلمیذ[1] امیر اللہ تسلیم) کے شاگرد تھے، لکھتے ہیں کہ "اس نیازکیش نے صحبت مشاعرہ ہر ماہ انگریزی کی یکم و پانزدہم کو قرار دی ہے۔ اور غزلیں مجتمع ہو کر بطور گلدستہ ہٰذا کے مطبع عاصی میں بتاریخ دہم و بست پنجم۔ حسب اسمائے دالاارسال ہوا کریں گی ...... ملتمس ہوں کہ آپ بھی بروز مقررہ بعد غروب آفتاب بمحلۂ لودی کٹرہ واقع عظیم آباد بمکان سید شاہ مبارک حسین[2] ...... رئیس (متخلص بہ مبارک شاگرد وحید الہ آبادی) قدم رنجہ فرما کر بندے کو ممنون فرمائیں ...... مصرع طرح ہے 'دل میں ہے اشتیاق شہادت بھرا ہوا' ضوابط گلدستۂ شعراء ...... جو حضرت کسی وجہ سے شریک مشاعرہ نہ ہو سکیں وہ ...... تاریخ مشاعرہ سے دو روز قبل ارسال فرمائیں تاکہ مشاعرہ میں پڑھی جائیں اور درج گلدستہ ہوں ...... اپنی اپنی غزلوں سے گیارہ گیارہ شعر منتخب کر کے ...... ارسال فرمائیں۔ گیارہ شعر طرح کے بلاقیمت اور اشعار غیر طرح اور گیارہ شعر سے زائد کے لئے فی شعر ایک پیسہ اجرت ہے۔

---

[1] واضح رہے کہ شیدا کا شاگرد تسلیم ہونا اس گلدستے سے ثابت نہیں، لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے تسلیم کا ایک خط جو حیات تسلیم مصنفہ مرش میں ہے اس پر شعر ہے ؎

تعلی شاگرد دو برادر خرد نایاب　　ذکر السعدین مصنفہ مہدی حسن خاں

مطبوعہ سنہ ١٢٩٢ھ میں نوروز علی خاں شیدا کے کہے ہوئے کئی قطعات تاریخ ہیں جن کے عنوان میں انھیں شاگرد تسلیم کیا گیا ہے ص ٧٩

[2] یہ سید شاہ محمد حسن بسمل شاگرد شاد کے جد مادری تھے۔ ان کا کلام پرانے گلدستوں میں ملتا ہے۔ ان کا دیوان مرتب نہ تھا مگر ان کے اشعار کی ایک بیاض تھی جو ان کے دوران حیات ہی میں غائب ہو گئی تھی۔

اور جو زیادہ چھپوائیں گے ان سے مطبع بکفایت پیش آئے گا..... چار آنہ ماہواری بطور اعانت مطبع دیا کرے گا ..... یہ مشاعرہ و گلدستہ کبھی موقوف نہ ہو گا ..... رمضان میں..... نعت اور محرم میں سلام کی طرح ہو گی"۔

گلدستۂ شعراء کا صرف پہلا شمارہ میری نظر سے گذرا ہے۔ (نمائش ادارۂ تحقیقات اردو) اور یہ ۲۵ اکتوبر ۱۸۷۷ء کا ہے۔ محمد اکبر خاں کے مطبع کا نام مطبع انتظامی تھا۔ اور گلدستہ سولہ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس میں بعض ایسی غزلیں بھی ہیں جن کے کہنے والے اس وقت زندہ نہ تھے۔ مثلاً غزل رند لکھنوی۔ آغاز جری کی غزل سے ہوتا ہے، پہلا شعر یہ ہے:۔

کھلے حمد حق میں دہن کیسے کیسے　　زباں سے برآئے سخن کیسے کیسے

اس کے بعد اسی زمین میں غزلہائے ذیل درج ہیں: غزل نعت جری، غزل رند، غزل شمس الدین اندرانی شمس، غزل سید حامد حسین نکہت عظیم آبادی۔

فنا ہو گئے اہل فن کیسے کیسے　　ہوئے بند باب سخن کیسے کیسے

غزل امیر اللہ تسلیم لکھنوی، غزل نور روز علی خاں شہید الکھنوی۔

ہوئے گلفشاں یاں دہن کیسے کیسے　　کھلے آج باغ سخن کیسے کیسے

یہ بہکا طریق محبت کا رہرو　　ملے راہ میں راہزن کیسے کیسے

مولا بخش مسیحا عظیم آبادی، غزل صغیر بلگرامی۔

ثبات گل و لالہ کیا پوچھتے ہو　　اڑے رنگ ہو کر چمن کیسے کیسے

غزل سید احمد حسین احمد عظیم آبادی۔

صغیر سخنور کی شفقت سے احمد　　کھلے ہم پہ راز سخن کیسے کیسے

یار علی متخلص بہ "جان صاحب" ریختی گو۔ طرحی غزلوں کے بعد شاہ محمد یحییٰ عظیم آبادی کے دو قطعات تاریخ جن میں سے ایک یہ:

شیدا ادیبی کہ عمر بردہ بزیاد — کردند چو بیت شعر خوانی بنیاد
تاریخ مشاعرہ دعا گو یحییٰ — برخواند کہ بزمِ شعر خوانی آباد

۱۲۹۴ قطعات کے بعد شمس الدین شمسؔ کی لغت جو "بعد ادائے فیس" داخل ہوئی۔ نظموں کا خاتمہ ننھو جو بے متخلص بہ بہارؔ عظیم آبادی کے مسدس پر ہوتا ہے۔ اس کی تمہید یہ ہے:

"یہ مسدس ۔ ایک شاعر ہمہ داں بلکہ بلبل ہندوستان ان کو کہنا چاہیئے کیوں کہ ان حضرت نے جو صنعت مسدس مذکور میں فرمائی ہے راقم گلدستہ کے دیکھنے میں کیا بلکہ سننے میں بھی نہیں آئی ہے...... مصنّف نے فیس ادا کر کے درج گلدستہ فرمایا ہے...... اور حضرت لودی کٹرہ خاص کے رہنے والے ہیں۔"

نٹ بازی اس کی دیکھئے دو دن کی کھیل ہے — حضرت طلسم دنیا کی کشن و کلیل ہے
ایسے غافل نہ رہو غافلو کچھ گیان کرو — بشنو برہما کی خواہ شیو کی کوئی دھیان کرو
درشن سے ترے اس گھڑی آنند ہو گیا — کلیوں کے تئیں پھول کے پرسنّ ہو گیا

آخر میں وہ "التماس" جس کے عبارات مقالۂ ہٰذا کے آغاز میں درج ہیں پہلا شمارہ کچھ اچھا نہیں' یہ گلدستہ کب تک جاری رہا اس کا حال مجھے معلوم نہیں۔

حاشیہ شاگرد برادر خرد نایاب مطبوعہ ۱۲۹۲ھ میں ان کے کہے ہوئے کئی قطعاتِ تاریخ ہیں جن کے عنوان میں انھیں شاگرد تسلیم بتایا گیا ہے۔ ص۹ ذکر السعدین ایک مذہبی مثنوی ہے اس کا آغاز اس بیت سے ہوتا ہے۔

لکھتا ہوں جو حمد کبریائی — خامہ بھی ہے صرف جبہہ سائی

اس کے آخر میں قطعی کا ایک قصیدہ اور غزل وغیرہ ہے' یہ سب نعت یا منقبت میں ہیں۔ نایاب صاحب دیوان مطبوعہ ہیں اور ریاض حسن خاں'

۱۴۴

خیال مرحوم کے والد۔ قصیدہ تعلی کے ابتدائی اشعار:

فرحتِ دل کے لئے کل جو گئے باغ تلک
گل و غنچہ کی ہر اک سمت کو پھیلی تھی مہک

نکہتِ گل سے معطر تھا تمامی گلشن
کہیں بیلے کی پٹ تھی کہیں جوہی کی گمک

چشمِ نرگس کا وہ عالم کہ اشارہ جس کا
حور کی آنکھ پہ ہر مرتبہ مارے چشمک

ایسا ہر نخل ہرا باد بہاری سے ہوا
جس کے پرتو سے نظر آنے لگے سبز فلک

ٹہنیاں بار سے پھولوں کے وہ جھک جاتی ہیں
جیسے کھائیں کہیں غنچہ دہانوں کی لچک

غنچے ہنستے تھے بجاتے تھے جلاجل پتے
چشمِ انجم سے سماں دیکھ رہا تھا یہ فلک

کلیم الدین احمد

کلیم الدین احمد نام، ۱۹۰۱ء کا نام ڈاکٹر عظیم الدین مرحوم ان کے نانا حکیم عبدالحمید پریشاں پٹنہ کے ماہر طبیب اور اردو فارسی اور عربی زبانوں کے سخنور تھے۔

کلیم صاحب کی پیدائش ۱۱ ستمبر ۱۹۰۸ء کو محلہ خواجہ کلاں (عظیم آباد) میں ہوئی۔ آپ نے بی۔ اے آنرس (انگریزی) اور ایم۔ اے دونوں میں فرسٹ کلاس میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ جس کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم کے لئے سرکاری وظیفہ ملا۔ اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان گئے۔ جہاں کیمبرج یونیورسٹی سے انگریزی ادب اور فرانسیسی زبان اور ادب میں ٹرائپوس حاصل کیا۔ ۱۹۳۳ء میں انگلستان سے واپس پٹنہ آئے۔ اس کے بعد پٹنہ کالج میں انگریزی کے پروفیسر ہوئے۔ بعد میں فیکلٹی آف آرٹس پٹنہ یونیورسٹی میں ڈین

عرضِ حال

کم از کم میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ایک تخلیق کار کے لئے تخلیقی کام آسان ہے بہ نسبت تحقیقی کام کے۔ اور اس میں خاص طور سے فنکاروں کی تحقیق۔ اور پھر ان کی تفصیلات کا حاصل کرنا بڑے صبر آزمائش کا مرحلہ ہوتا ہے۔ چوں کہ وطنی جذبہ میرے دل میں شروع سے ہی رہا ہے۔ لہذا لوگوں کے ہزار کہنے کے باوجود کہ یہ کام آسان نہیں ہے، میں لگ گیا۔ اور خدا کے فضل وکرم سے بہت حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی رہا۔ میں نے اپنا کام قدیم شہر عظیم آباد کے علاقہ پٹنہ سٹی سے شروع کیا تو دیگر فنکاروں کی طرح میں جناب احمد تبسم صاحب سے بھی ملا جنھوں نے میرے تحریری خاکہ کو دیکھا اور کہا کہ آپ کتنے خاکے تیار کرسکیں گے؟ یہ کام آسان اس طرح ہو سکتا ہے کہ اسے سائیکلو اسٹائل پرنٹ کروالیں اور اس معاملے میں میں آپ کی مدد کرسکتا ہوں۔ پھر کیا تھا میں نے جھٹ سے ہاں کہہ دی۔ اور انھوں نے مجھے چھپے ہوئے خاکے دیئے۔ اس طرح مجھے کام میں دلچسپی اور بھی بڑھ گئی۔ کیوں کہ جب راستہ کشادہ ہوتا ہے اور مددگار ملتا جاتا ہے تو دل بھی بڑھتا ہے۔ لیکن جہاں دل بڑھا تو وہاں دل کو چوٹ بھی لگی۔ کتنے لوگوں نے مذاق بھی اڑایا۔ اور مایوس کرنا چاہا۔ لیکن مجھے اپنی تکلیف پر رونا کبھی نہ آیا۔ بلکہ ان لوگوں کی عقل پر رونا آیا جو نہ خود کچھ کرتے ہیں اور نہ کرنے والے کو کچھ کرنے دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عظیم آباد کے ماہر قدآور اور باکمال فنکاروں

منتخب ہوئے۔ پھر صدر شعبہ انگریزی (پٹنہ یونیورسٹی) کے بعد پٹنہ کالج میں پرنسپل ہوئے اس کے بعد ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم بہار، ڈائریکٹر خدا بخش اورینٹل لائبریری، چیئرمین اسکول اگزامینیشن بورڈ بہار، ڈائریکٹر انگریزی اردو ڈکشنری ترقی اردو بورڈ ہند کے عہدوں پر فائز ہوئے۔

اردو شاعری کی تنقید کی دنیا میں جو بت خانہ آذر تھی، بت شکن مشہور ہیں۔ ان کی تصنیفات "اردو شاعری پر ایک نظر"، "اردو تنقید پر ایک نظر"، "حسن داستان گوئی"، "سخن ہائے گفتنی"، "عملی تنقید" وغیرہ تنقید اور تحقیق کی دنیا میں حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہیں۔ ۱۹۳۹ء میں اپنے والد ماجد ڈاکٹر عظیم الدین احمد کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کو جمع کر کے "گل نغمہ" کے نام سے شائع کیا۔ اور اس کے ماسوا ۱۹۶۶ء میں اپنی بیالیس چھوٹی بڑی نظموں کا ایک انتخاب "بیالیس نظمیں" شائع کیا۔ آپ کی ادبی خدمات کے سلسلے میں مرکزی حکومت ہند کے عطیہ غالب ایوارڈ کو قدر شناسی کی ابتدا کہا جا سکتا ہے۔ ۱۹۸۲ء میں انھیں پدم شری کا ایوارڈ بھی ملا ہے۔ نمونۂ تحلیل میں آپ کے ایک تنقیدی مضمون بعنوان "اردو میں تبصرہ نگاری" کے چند اقتباسات ملاحظہ ہو:

"تبصرہ ایک فن ہے۔ اور فن تنقید کی ایک شاخ اردو میں فن تنقید اس کے اصول اور اغراض و مقاصد سے صحیح واقفیت نہیں۔ اسی وجہ سے اردو تبصرہ نگار میدانِ تبصرہ میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کر سکتے اور اسے فنی حیثیت سے نہیں برت سکتے۔ ان کے خیال میں تبصرہ کا مفہوم بے انتہا تعریف یا شدید تنقیص ہے۔ اور یہ تعریف یا تنقیص کسی اصول کے ماتحت نہیں ہوتی، اگر کسی وجہ سے۔ اور یہ وجہ ہمیشہ غیر متعلق ہوتی ہے۔ کتاب زیر نظر پسند ہے تو تعریف کی بھرمار ہوتی ہے۔ اگر ناپسند ہے تو

ہجو کی بوچھار ہوتی ہے۔ دونوں صورتوں میں کوئی سنجیدہ معیار پیشِ نظر نہیں ہوتا اور سمجھ بوجھ صداقت حقیقت پسِ پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ اگر تصنیف عام پسند ہے تو اس کی تحسین لازمی ہے۔ اگر کسی مشہور و معروف مصنف کے قلم سے نکلی ہے تو اس کی ستائش ضروری ہے، اگر کسی ذی مرتبہ شخص کی فکرِ طبع کا نتیجہ ہے (خصوصاً ایسا شخص جس سے صلہ کی کچھ امید ہے) تو اس کی مدح میں قصیدے لکھے جاتے ہیں۔ اگر اپنے ہم وطن اپنے مخصوص حلقہ کے کسی فرد یا کسی دوست کی کمائی ہے تو اس کی مبالغہ آمیز تعریف و توصیف میں رات کو دن اور دن کو رات ثابت کر دینا معمولی سی بات ہے۔"

"اردو میں غالباً سب سے پہلے عبدالحق صاحب نے کچھ فنِ تبصرہ کی اہمیت کو سمجھا اور اس کو خامیوں سے پاک کرنے کی کوشش کی۔ اسی وجہ سے وہ تبصرے جو پہلے اردو میں نکلتے تھے۔ دوسرے تبصروں سے اچھے ہوتے تھے۔ ان میں غیر جانبدارانہ رائے پیش کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اور تبصرہ کو خارجی اثرات سے کسی قدر بچایا جاتا تھا۔ یہی غیر جانبداری ایک حد تک "نگار" کی خصوصیت ہے۔ لیکن جو تبصرے آج کل اردو میں نکلتے ہیں وہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔"

تبصرہ کا مقصد ہے کسی کتاب کے جوہر کا پتہ لگانا اور اسے اجمال یا تفصیل کے ساتھ پیش کرنا اور جو کچھ کہا جائے اس سے کتاب کی اہم ترین خصوصیتیں (خوبیاں اور برائیاں دونوں) واضح ہو جائیں یہ اسی وقت ممکن ہے جب صحیح معیار موجود ہوں۔ ان کی عدم موجودگی میں تبصرہ لکھنا گویا ایسا ہے جیسے کوئی اندھا کسی تاریک کمرے میں کسی کالی بلی کا متلاشی ہے جو وہاں موجود

نہیں۔ اردو کے جاگیر داروں کو اگر کوئی نیا راستہ دکھایا جاتا ہے۔ اگر انھیں تنگ و تاریک کھائی سے نجات دلا کر پہاڑ کی روشن چوٹی کی طرف بلایا جاتا ہے تو وہ خفا ہو جاتے ہیں۔ ان کے احساس خودداری کو ایسا صدمہ پہونچتا ہے کہ وہ برافروختہ ہو جاتے ہیں ایسی حالت میں قابل قدر تبصروں کا وجود ممکن نہیں۔"

محمد ذکی الحق

محمد ذکی الحق ابن مولوی محمد رضی الحق، کی پیدائش محلہ کمھرار پٹنہ میں ۱۱ر جنوری ۱۹۲۰ء کو ہوئی۔ آپ کی علمی لیاقت بی۔ اے (آنرز فارسی)، ایم۔ اے (فارسی)، ایم۔ اے (اردو) اور ڈی لٹ ہے۔ جی۔ این کالج پٹنہ میں بحیثیت استاد شعبہ اردو، مصروفِ تعلیم و تدریس رہنے کے بعد اب ریٹائرڈ ہیں۔ آپ کے ادبی اساتذہ پروفیسر عبد المنان بیدلؔ، پروفیسر سید حسین اور پروفیسر عطاء الرحمن کاکوی ہیں۔ باضابطہ طور پر آپ کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۶ء سے ہوا۔ نثر نگاری میں افسانے، تنقیدی اور تحقیقی مضامین کے علاوہ اصنافِ سخن میں غزل، نظم اور قطعہ پر طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کی بیشتر تخلیقات ندیم، سہیل اور ادب لطیف جیسے رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ تقریباً ساٹھ تنقیدی مقالے اور کتابوں پر تبصرے ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں۔ آپ کی مطبوعہ تصنیفات "ذکر و مطالعہ" اور "مطالعۂ آزاد" ہیں۔ رباعیاتِ شہباز زیر طبع ہے۔ غالبؔ، اقبالؔ، فیضؔ، حالیؔ، آلِ احمد سرورؔ، قاضی عبدالودود اور کلیم الدین احمد آپ کے

پسندیدہ شعرا و ادبا رہیں۔ نمونۂ تخلیق میں آپ کے ایک مضمون بعنوان "اردو کی مزاحیہ شاعری" کے چند اقتباسات منسلک ہیں:۔

"اردو شاعری کا آپ جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ خون کے آنسو رلانے والی شاعری کے ساتھ ساتھ مزاح اور ظرافت کی حامل نظموں اور غزلوں کی بھی کمی نہیں۔ اردو کی مزاحیہ شاعری کا پہلا دور ہجو سے شروع ہوتا ہے۔ شاعری کی یہ صنف جاگیردارانہ دور کی یادگار ہے۔ یہ وہ دور تھا جب انسان کے مزاج میں نوابی اور ریاست کی شان باقی تھی۔ کسی کی گستاخی برداشت نہ ہوتی تھی۔ گالی کا جواب گالی سے دیا جاتا تھا۔ مزاج میں ایک طرح کی اکڑ تھی۔ غصہ غضبناک تھا۔ جب شاعر کو غصہ آتا تھا تو وہ اپنے حریف کی ہجو لکھ مارتا تھا۔"

انشا اور مصحفی کی معرکہ آرائی نواب آصف الدولہ کو بہت پسند آئی اور انھوں نے ان کو انعام و اکرام سے مالا مال کیا۔ مصحفی کے مقابلے میں انشا کی ہجو نگاری کا دائرہ وسیع تھا۔ انھوں نے بھڑوں، کھٹملوں، مکھیوں اور مچھروں پر ہجویں لکھی ہیں۔ انشا کے بعد نظیر اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ نظیر کو نیاز فتحپوری نے "شگفتہ باز" کہا ہے۔ نظیر اپنی زندہ دلی اور چشکہ بازی کے لئے مشہور ہیں۔ ان کی غزلوں اور نظموں میں ان کی زندہ دلی ہمیشہ نمایاں رہتی ہے۔"

"اکبر کے بعد ظریف، احمق پھپھوندوی، ناز بریلوی، جوکر لکھنوی، چناں لکھنوی، انجم مانپوری، بگٹٹ عظیم آبادی، واہی اور سید جعفری، طنز و ظرافت کے میدان میں آئے لیکن اس فن کو کوئی بھی اکبر سے آگے نہ بڑھا سکا۔

بگھٹ عظیم آبادی کے یہاں اکبری رنگ کو برتنے کی کوشش ملتی ہے۔ لیکن ان کے یہاں طنز کم اور ظرافت زیادہ ہے۔ واہی اور سید جعفری طنز و مزاح کے گر سے واقف ہیں۔"

"طنز و مزاح اردو شاعری کی رگ رگ میں داخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کی مزاحیہ شاعری اور اس کی مقبولیت یزدانی نظر آتی ہے۔ اور اسی مقبولیت کے سہارے اس کا مستقبل روشن اور درخشاں ہے۔"

ضیا عظیم آبادی

مجید الحسن نام، ضیا تخلص ابن سید شاہ عزیز الحسن کی پیدائش اپنے وطن عظیم آباد کے محلہ شاہ کی اٹی میں یکم جنوری ۱۹۲۲ء کو ہوئی۔

ابتدائی تعلیم پٹنہ سٹی اسکول منگل تالاب سے حاصل کی۔ اس کے اورینٹل کالج لاہور میں تعلیم پائی۔ شعری دلچسپی عہد طالب العلمی سے ہو چکی تھی۔ دودی گھاٹ پٹنہ سٹی میں بابو چندن پت سہائے کے یہاں ایک مشاعرہ ہوا جس کی طرح تھی ؎ "گم ہو کے ڈھونڈ لوں میں کسی کو خدا کرے۔" اسکول کے اردو معلم مولوی مجید صاحب کی تحریک پر انھوں نے بھی کچھ اشعار کہے اور حمید عظیم آبادی کے پاس اصلاح کے لئے گئے جہاں انھوں نے ان کا کافی دل بڑھایا۔ اور امداد عظیم آبادی نے بھی کافی حوصلہ افزائی کی۔ پھر کلکتہ گئے جہاں آغا حشر سے قربت حاصل ہوئی۔ آغا حشر خود تو نہیں لکھتے تھے بلکہ بولتے تھے اور دوسرے لکھا کرتے تھے۔ لہٰذا ان کے

ذمہ بھی وہی کام سپرد ہوا۔ وہیں آرزو لکھنوی سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان حضرات کی شفقت و محبت کے سائے میں انھوں نے ایک ڈرامہ "وطن کی عید" لکھا۔ جو آغا صاحب کے توسل سے کامیاب اسٹیج ہوا۔ چنانچہ الفریڈ کمپنی میں بہ حیثیت ڈرامہ نگار ملازمت کی۔ مگر دل نہ لگا اور ملازمت سے دستبردار ہو کر اورینٹل کالج لاہور میں داخل ہو گئے۔ وہاں سعادت حسن منٹو، امتیاز علی تاج، حکیم احمد شجاع وغیرہ سے قربت رہی۔

لکھنا آپ کا ذریعہ معاش اور مشغلہ دونوں ہے۔ ۱۹۵۶ء میں پٹنہ سے لکھنؤ چلے گئے۔ آج کل شعر و شاعری سے بیگانہ ہو کر نثر کی طرف سارا رجحان ہے۔ تقسیم سے پہلے لاہور سے ان کا افسانوی مجموعہ، اور کچھ ناول بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے ماسوا "شاد عظیم آبادی پر ایک نظر" اتر پردیش اردو اکاڈمی کی مالی اعانت سے زیر طبع ہے۔ اقبال پر بھی ایک کتاب زیر طبع ہے۔ اب آپ تنقیدی مضامین سے زیادہ رغبت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فنی اعتبار سے کلیم الدین احمد، اور شمس الرحمٰن کی صلاحیتوں کے بے حد معترف ہیں۔ سنگ میل، تجلی (کلکتہ) بہار پنچ (پٹنہ) اور حدیثِ دل (لکھنؤ) کے مدیر بھی رہ چکے ہیں۔ نمونۂ تخلیق میں آپ کے ایک مضمون بعنوان "تنقید اور نقاد" کے چند خاص اقتباسات یہ ہیں :-

"تنقید بھی ایک تخلیقی عمل ہے اور غلامانہ صلاحیتیں سب کو میسر نہیں ہوتیں یہ تو صحیح ہے کہ درسی تعلیم اور مطالعہ سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور ہم بہت سے منھ کی اگلی ہوئی باتوں کو دوہرا کر اور یکجا کر کے اپنی وسعتِ نظری کا ثبوت بھی دے سکتے ہیں۔ پھر بھی ایک صحیح نقاد کا رول ادا نہیں کر سکتے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نقاد کا رول کیا ہے

تو مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے جو محض جرح نہیں بلکہ مونس بھی ہو، فنکار کے قلب تک رسائی حاصل کر سکے اور غیر جانبدارانہ انداز میں یہ محسوس کر سکے کہ فنکارانہ عمل کتنا جاندار ہے؟ وہ دوست بھی ہوتا ہے اور رہنما بھی۔ ظاہر ہے کہ ان خصوصیات کا اجتماع آسان نہیں جس کے اپنے پہلو میں دلِ گداختہ نہ ہوگا۔ وہ کسی دوسرے کے دل کی چوٹ کو کیا سمجھے گا؟

کیا بہتر ہو کہ تنقید کرنے سے اور نقاد بننے سے پہلے اپنے میں خود تنقید کی صلاحیت پیدا کر لی جائے۔ چونکہ نقاد کے پہلو میں نطشے کے سوپر مین کا دل چاہیئے۔ وہ بت پرست نہیں بلکہ بت شکن ہوتا ہے۔ اس کا کام مفروضات پر ایمان رکھنا نہیں ہے۔ بلکہ تلاش و تجسس ہے۔ وہ سائنسی ذہن کا مالک ہوتا ہے۔ اسے لعن و طعن سے بے پرواہ ہو کر تیشہ اٹھانا واجب ہے۔ وہ فرہاد ہوتا ہے اور جوئے شیر لانے کے لئے پہاڑوں کا کلیجہ چیر دیتا ہے۔ اب ذرا ہمارے نقاد ایمان سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہیں کہ ان میں سے کتنے اس کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں ــــــ؟

کسی سے متاثر ہونا عیب نہیں۔ بغیر اچھے یا برے تاثر کے اظہار رائے ممکن ہی نہیں ہے۔ لیکن آنکھوں پر لال پیلی عینک لگا کر سب کچھ سرخ یا زرد بتانا شایانِ شان نہیں تنقید کرنے سے پہلے یہ طے کر لینا کہ فلاں کو بے عیب بتائیں گے اور فلاں میں کیڑے نکالیں گے دیانتداری نہیں۔ نقاد کا کام غیر جانبدارانہ تجزیہ ہے۔ مکھی پر مکھی بٹھانا نہیں۔ اسے زیادہ سے زیادہ علوم و فنون سے واقفیت اور وسعت نظری کے ساتھ ساتھ وسیع القلب ہونا بھی لازم ہے

ایک نقاد کو ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ اور یہ کبھی نہ بھولنا چاہیئے کہ فکر میں گہرائی اور غیر جانبداری اسی وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب توازن کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور تصویر کے دونوں رخ سامنے رکھے جائیں۔ نقاد نہ کسی کا نقیب ہوتا ہے نہ حریف اس کی تخلیقات آئندہ نسل کے لئے ایک ایسی شمع ہونی چاہیئے جس کی بدولت وہ بجا طور پر کسبِ نور کر سکے۔ مگر تجربہ و مطالعہ بتاتا ہے کہ ہمارا اندازِ تنقید تعلقات کا اسیر ہے۔

تنقید بڑا کٹھن راستہ ہے۔ آپ اسے پلصراط سے بھی زیادہ باریک کہہ سکتے ہیں۔ ایک نقاد کو یہ زیب نہیں دیتا کہ کوئی اپنی معاشرتی پوزیشن کے باعث اگر سماج کے لئے قابل قدر ہو گیا تو وہ بھی آنکھ بند کر کے ایمان لے آئے۔ انقلابی، فلسفی، سیاسی، مذہبی وغیرہ وغیرہ ہونا اور چیز ہے اور ادیب یا شاعر ہونا اور چیز۔ یاد رکھئے بغیر غور سے رائے قائم کرنا گناہِ عظیم ہے۔

اردو زبان میں فن تنقید نے بلاشبہہ قابلِ قدر ترقی کی ہے۔ اور یقینی عظیم نقاد پیدا کئے ہیں لیکن اس حقیقت سے بھی چشم پوشی گناہِ کبیرہ ہے کہ ہر معلمِ اردو کے لئے اسے لازم قرار دے کر غیر معمولی ستم کیا گیا ہے۔ استاد ہونا اور چیز ہے۔ نقاد ہونا اور چیز ہے۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر معلمِ زبان و ادب پرکھ کا مادہ بھی رکھتا ہو۔ اور کسی غیر معلم میں اس کا وجود ہی ممکن نہ ہو۔

قیوم خضر

قیوم خضر، مسکن عظیم آباد۔ تاریخ پیدائش ۱۹۲۳ء ہے۔
نثر اور نظم دونوں پر عبور حاصل ہے۔ لیکن نثر آپ کا خاص موضوع ہے۔ آپ کی نگارشات مختلف رسائل میں شائع ہونے کے علاوہ ریڈیو سے بھی نشر ہوتی رہتی ہیں۔

ماہنامہ اشارہ پٹنہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۳ء تک آپ کی ادارت میں برابر شائع ہوتا رہا اور پھر اس کے بعد ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۵ء تک ہفتہ وار جریدہ کی شکل میں شائع ہوا۔ اردو درپن، اردو زبان اور قومی ایکتا، حالاتِ حاضرہ اور ہندوستانی مسلمان (کتابچہ) صادقپور پٹنہ قربان گاہِ آزادیِ وطن آپ کی اہم مطبوعہ تصنیفات ہیں۔ نمونۂ تخلیق ملاحظہ ہو:

"نشترِ نوکِ قلم!"

(خیالات کی وہ لہریں جو شعور کی تہوں میں دبی ہوئی گنگناتی رہتی ہیں اور کبھی کبھی حالات کی ضرب کاری سے چھلملا کر ذہن کی سطح پر اس طرح ابھرتی ہیں کہ جس کی تلاطم خیزیوں کو دیکھ کر وقت کے بڑے بڑے فرعونیں کے بھی دل ڈوبنے لگتے ہیں۔)

سوسن نے گلاب سے سرگوشی کے انداز میں کہا: کانٹوں سے کہو کہ نوکِ زبان تیز کرلیں، پوچھا: کیوں؟

کہا: نرگس نے ابھی ابھی دیکھا ہے کہ خارتگروں کی فوج آرہی ہے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد باغ کا یہ نقشہ تھا کہ تمام پھول جوتوں سے کچل دیئے گئے اور شاخوں میں آگ لگادی گئی۔ باغبان نے اس طرح اپنی محنتوں

کا لہو بہتے ہوئے دیکھا تو احتجاجاً چیخ اٹھا: ایسا کیوں کر رہے ہو؟ جواب ملا: شہنشاہِ مملکتِ مغیلاں و بیابان حضرت دلخراش ابن گلتراش الملقب بہ گلچینِ اعظم کا حکم ہے کہ اس مجوّزہ خطۂ زمین پر پھولوں کی بجائے اب صرف دھتورے اور ببول کے کانٹے ہی رہیں گے۔ باغباں نے دوبارہ احتجاج کیا: پھولوں کی بستی اجاڑ کر کانٹوں کا شہر کیوں بساتے ہو؟ آئینۂ حسن سے اس کی آبرو کیوں چھینتے ہو؟؟

جواباً، احتجاج کے اس جرم میں باغباں کی انگلیاں تراش لی گئیں اور آنکھوں میں کانٹے چبھو دیئے گئے۔ بلبل نے ماتم کیا تو زبان کاٹ لی گئی کہ کوّوں کے دیس میں اس کی کیا ضرورت؟ شبنم روئی تو سورج کی صلیب پر چڑھا دی گئی!

۱

نذر امام

سید نذر امام ابن سید احمد حسین، مارچ ۱۹۲۴ء کو ملک پور ضلع دربھنگہ میں پیدا ہوئے لیکن آبائی وطن عشری ضلع سارن اور مسکن عظیم آباد ہے۔

چھپرہ ضلع اسکول سے میٹرک پاس کیا، اس کے بعد سائنس کالج پٹنہ سے آئی۔ ایس۔ سی پاس کیا پھر میڈیکل کالج سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس مکمل کیا۔ اور محکمۂ صحت سے منسلک ہو گئے۔ اگست ۱۹۶۸ء میں حکومت بحرین کی دعوت پر آئی اسپیشلسٹ کی حیثیت سے بحرین بھی گئے۔ یہاں ان کو دل کا پہلا دورہ پڑا۔ بحرین سے نومبر ۱۹۷۰ء میں پٹنہ

کی تفصیلات اور کارنامے ان کے ساتھ تہہ خاک ہو گئے۔ بہرکیف میں اپنے ارادے پر ڈٹا رہا اور خط و کتابت کے ذریعے اس کام سے ان فنکاروں کو بھی باخبر کیا، جو شہر سے باہر یعنی مظفرپور، لکھنؤ اور شہر میں پاٹلی پترا، کرشنا پوری، کنکر باغ اور دانا پور وغیرہ میں رہتے تھے۔ انھیں خاکے بھی بھیجے اور خود بھی کافی لوگوں سے ملا۔ اس کے باوجود کچھ فنکاروں نے تعاون نہیں دیا۔ حالانکہ میں بار بار ان لوگوں سے ملتا رہا اور التجا کرتا رہا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ٹس سے مس نہ ہوئے تو میرا کیا قصور؟ ذرا ان فنکاروں کے نام آپ بھی ذہن نشین کر لیجئے، تاکہ ان کو اور آپ کو دونوں کو مجھ سے شکایت نہ رہے۔ ان کے اسمائے گرامی ہیں: شیخ جاوید، سلمیٰ جاوید، قرالتوحید، شمیم افزا قمر اور دیگر۔

میرے اس کام میں جن بزرگوں، عزیزوں اور احباب نے کسی بھی صورت سے میری مدد کی یا اپنا تعاون دیا ان میں فنکاروں کی حیثیت سے جناب عطا کاکوی، بدرالدین احمد بدر، غضنفر نواب دانش، سید ناصر حسین زیدی اور احمد تبسم وغیرہ۔ اور عزیزوں میں مظفر بلخی (عالم گنج)، حسن احمد (گورنمنٹ اردو لائبریری) وغیرہ ہیں۔ اس کے علاوہ میں اپنے استاذ محترم جناب سید ناصر حسین زیدی صاحب کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا، جن کی رہنمائی میرے ساتھ اب تک ہے۔

اس کتاب میں تذکرے دو حصوں میں تقسیم کئے۔ اول حصہ منظومات اور دوئم حصہ منثورات، جن میں پہلے مضمون نگاروں اور بعد میں افسانہ نگاروں کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ ماضی کے فنکاروں کا مختصر سا خاکہ بارہویں صدی ہجری (۱۱۱۶ھ) سے چودھویں صدی ہجری (۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء) کے اوائل تک پیش کیا گیا ہے۔ حال کے فنکاروں کا تذکرہ (۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء) سے شروع کیا گیا ہے جس کے سرخیل حضرت علامہ قتیل دانا پوری ہیں، جن کا سایہ عاطفت آج بھی ہمارے

واپس آئے۔ تقریباً ایک سال حیات رہ کر ۲۸ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو رحلت فرما گئے۔

جہاں تک نذر امام کی شخصی حیثیت کا تعلق ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ امراضِ چشم و گوش کے ماہر سرجن کی حیثیت سے مشہور رہیں بلکہ ایک ہمدرد ڈاکٹر منکسر المزاج اور خوش اخلاق انسان بھی تھے، اس کے علاوہ اردو ادب کے اچھے انشائیہ نگار کی حیثیت سے بھی مقبول رہے۔ ان کی دلچسپیاں اور مصروفیتیں صرف سائنس اور سرجری تک ہی محدود نہ تھیں، وہ ادب و صحافت میں بھی دخل و دستگاہ رکھتے تھے۔ مضمون نگاری، سخن سنجی اور صحافت سے ان کو ذہنی لگاؤ تھا۔ ان کی بہترین نگارش کا نمونہ "سفرستان" ہے، جو پہلے صبحِ نو پٹنہ میں قسط وار شائع ہوتی رہی اس کے بعد مکتبہ صبحِ نو سے کتابی صورت میں شائع ہوئی جس پر حکومتِ اتر پردیش نے پانچ سو روپے کا انعام بھی دیا۔ دوسرا مجموعہ "زخم و نشتر" ہے۔ نمونۂ تخلیق میں آپ کے انشائیہ بعنوان "ہم کہ ہیں اپنی وضع کے پابند" کے چند اقتباسات منسلک ہیں:۔

غدر کے ہنگامے کے بعد جب پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو مرزا نوشہ کو بھی بلایا گیا۔ کرنل براؤن کے روبرو پیش ہوئے تو وہی کلاہِ پیاخ جو مرزا پہنا کرتے تھے حسبِ معمول ان کے سر پر تھی۔ اس کی وجہ سے عجیب و غریب وضع قطع معلوم ہوتی تھی۔ اس حلیہ کو دیکھ کر کرنل براؤن نے شاید طنزاً کہا۔ "ویل مرزا صاحب! تم مسلمان ہے؟ مرزا صاحب نے نہایت متانت سے جواب دیا" ہاں آدھا مسلمان ہوں۔" کرنل براؤن نے گھبرا کر پھر پوچھا "یہ آدھا مسلمان کیا؟" تو مرزا صاحب بولے "آدھا یوں کہ شراب پیتا ہوں اور سور نہیں کھاتا۔" دیکھا آپ نے صرف ایک امتیازی ٹوپی نے وضعداری

کی کیسی عکاسی کر دی اور ثابت کر دیا کہ یہ وضع غیروں کے ذہن پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ نہ صرف پہناوے میں بلکہ عادات و اطوار میں بھی وضعداری و ضعداری والوں کو کس طرح لاجواب کر دیتی ہے۔

اب رہی بات پینے پلانے کی تو جناب ٹھنڈے پانی کا عاشقِ زار ہوں۔ جاڑے میں بھی نل کے پانی سے زیادہ صراحی یا فریج کے پانی کو ترجیح دیتا ہوں۔ پلانے کی حد، چائے یا شربت تک جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ باقی رہیں اور چیزیں جن سے حضرت غالبؔ بھی مغلوب تھے۔ تو صاف صاف بات یہ ہے کہ ٹیمس اور خلیجِ فارس و عرب کی جدید ترین موجوں میں ڈوب کر بھی دامن تر نہیں کر سکا صرف اس لئے نہیں کہ مذہب نے روکا ہے بلکہ زیادہ اس لئے کہ ہم اپنی وضع کے پابند ہیں۔

جہاں تک حلقۂ احباب کا تعلق ہے اس میں شاعر ہیں، ادیب ہیں، اور صحافی بھی۔ شاعر حضرات اپنے کلام کو سنانے میں فرمائش وضع کے پابند ہیں۔ ادھر التجا اور اصرار ادھر عذر اور انکار۔ مگر خیر سے ایک دوست ہیں بالکل سر آتشہ یعنی ڈاکٹر ہیں۔ حافظ ہیں اور شاعر ہیں۔ اچانک نازل ہوتے ہیں۔ خود ڈائری کھول لیتے ہیں اور بالکل شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ سناتے ہیں ہم سنتے ہیں۔ وہ اپنی وضع پر قائم اور ہم اپنی وضع کے پابند۔

سیّد محمد حسنین

ڈاکٹر سید محمد حسنین ۲۶ جنوری ۱۹۲۵ء کو عظیم آباد (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں اردو ادب میں ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ اور مرزا محمد علی فدوی کی شاعری پر ایک طویل اور بسیط مقالہ لکھ کر بہار یونیورسٹی سے ۱۹۵۶ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ آج کل مگدھ یونیورسٹی (گیا) کے صدر شعبۂ اردو ہیں۔ ح۔ م۔ اسلم کے نام سے انھوں نے افسانے بھی لکھے ہیں۔

آپ ایک اچھے انشا پرداز تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان کی تصنیفات میں "بہار کے نو چراغ"، "صفتِ انشائیہ اور چند انشائیے"، "نیل مرام" "مرزا علی فدوی انکا عصر حیات اور شاعری" مشہور ہیں۔ بحیثیت تخلیق کار آپ کے ایک طویل مضمون (جو کتاب "صفت انشائیہ اور چند انشائیے" میں بطور مقدمہ کے طور پر شامل ہے) کا ایک حصہ بنام "ادب لطیف اور انشائیہ" کے چند اقتباسات پیش ہیں:۔

انشائیہ کو "ادب لطیف یا انشائیۂ لطیف" جس میں مصطلحات سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ نامزدگی صحیح نہیں۔ یہ اسی طرح نامناسب ہے۔ جیسے ہمارا اور آپ کا 'حیوان' جیسے عامیانہ لفظ سے یاد کیا جائے۔ آپ اتفاق کریں گے ہم حیوان کی ایک قسم ہیں۔ اور مخصوص قسم۔ کارخانۂ قدرت کے اس ارضِ بسیط پر ہمارا مرتبہ و مقام انسان کا ہے۔ چرند یا پرند یا دوسرے حیوان کا نہیں۔ اسی طرح انشائیہ بھی ادب لطیف میں داخل ہے پر یہ ادب لطیف کی ایک خاص صورت ہے ادب اور ادب لطیف کی

مختلف اصناف کے پیشِ نظر انشائیہ کو ہم ایک مخصوص صنعتی مقام دیتے ہیں۔ ادب میں اس کا رشتہ ادب لطیف سے ہے۔ اور یہ رشتہ بڑا قریبی ہے۔ ادب سنجیدہ سے اس صنف کا تعلق محض رسمی ہے۔

ادب لطیف زبان و ادب کا وہ حصہ ہے جس میں علوم اور سائنس کا گذر نہیں۔ یہ انسان مہذب و متمدن انسان کی وہ حسّی و ذہنی تجریدی کاوشیں ہیں جو اساسی طور پر تاثرات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ان میں نہ علوم اور نہ سائنس جیسی سنجیدگی ہوتی ہے اور نہ ان کی جیسی خشک بیانی۔ ادب لطیف کی باتیں نرم، نازک اور لطیف ہوتی ہیں۔ یہ ہمارے دل و دماغ سے سنجیدگی کی طالب نہیں ہوتیں۔ یہ براہِ راست ہمارے احساس کو چھوتی ہیں۔ ہمارے جذبات و تخیلات سے یہ رشتہ رکھتی ہیں اور ہمیں نت نئے کوائف سے ہمکنار کر دیتی ہیں۔

انشائیہ نگار کا تعلق ادب سنجیدہ سے نہیں ہوتا، ادبِ لطیف سے ہوتا ہے۔ اور یہ تعلق بہت گہرا ہوتا ہے۔ اس کی شریعت اور طریقت دونوں کا حساب کتاب ادب لطیف کے ذمہ ہوتا ہے۔ اس کی زبان اور دماغ دونوں شاعر کے ہوتے ہیں۔ مفکر یا سائنسداں کے نہیں ہوتے۔ وہ ادب لطیف کی خاک سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اسی کی خاک اڑاتا ہے۔ لیکن اس گہرے تعلق سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کہ ادب سنجیدہ کی لہریں اس کے لئے آؤٹ آف بانڈ ہوتی ہیں یا فلسفہ و حکمت، علوم اور سائنس جیسے شعبہائے ادب سنجیدہ کے پاس انشائیہ نگار کا پھٹکنا بھی محال ہے۔ وہ ادب کے ہر شعبہ اور زندگی کے ہر گوشے میں پہنچ سکتا ہے اس کے لئے کوئی روک ٹوک

نہیں ۔ وہ آزاد و خود مختار ہے ۔

ناصر زیدی

سید ناصر حسین زیدی ابن علامہ سید عدیل اختر کی پیدائش سند کے اعتبار سے ۱۹۳۱ء کو علی نگر پالی میں ہوئی ۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی ۔ ۱۹۳۹ء میں جامع العلوم جوادیہ بنارس میں داخلہ لیا ۔ اور ۱۹۴۸ء میں وہاں کی آخری سند نخر الافاضل حاصل کی ۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے فاضل اور دبیر کامل، بہار مدرسہ اکزامینیشن بورڈ سے پانچ سبجکٹ میں فاضل اور انگریزی میں میٹرک ہیں ۔ فی الحال ۱۹۵۴ء سے محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ سٹی میں مصروف درس و تدریس ہیں ۔ گذشتہ بارہ سال سے پندرہ روزہ "الناصر" کے ایڈیٹر اور ایک درجن سے زیادہ کتابوں کے مترجم، "گلدستۂ ہر سرمایۂ نشاط" کے مولف اور "صدق صفا" کے مصنف ہیں ۔ بچوں کے لئے اردو ماہنامہ "شگوفہ" اور پھر "اردو دارا" نکالا، جو بعد میں بند ہو گیا ۔ بانگِ درا کی تیس نظموں کی شرح آپ نے ہی لکھی تھی، جو بہت مقبول ہوئی ۔

نثر اور نظم دونوں میں درک حاصل ہے ۔ آپ کی مختلف الانواع تخلیقات رسالوں، پرچوں اور اخباروں میں اکثر شائع ہوتی رہتی ہیں ۔ ان میں علمی، ادبی، سائنسی، مذہبی، معلوماتی، تحقیقی، تنقیدی مقالے، انشائیے، غزلیں، نظمیں اور پیروڈی وغیرہ سبھی چیزیں شامل ہیں ۔ لیکن کسی ایک رنگ کا کافی سرمایہ نہیں ہے ۔ تحریر میں روانی اور سلاست ہے

آپ کی تخلیقات پشاور، لکھنؤ، اور پٹنہ ریڈیو سے نشر ہو چکی ہیں۔ ادبی خدمات پر انھیں بہار اردو اکاڈمی انعام دے چکی ہے نمونۂ تخلیق میں آپ کے انشائیہ بعنوان "بغیر چاند کی عید" کے دو حصے ملاحظہ ہوں:۔

"آج ۲۸ رمضان ہے۔ دیکھئے چاند کب ہوتا ہے۔ اگر کل ہوا تو پرسوں کیا ہوگا؟ ابھی تنخواہ کا بھی سوال نہیں۔ پندرہ دن باقی ہیں۔ اس مہینہ کی نصف سے زائد تنخواہ بنئے نے کھائی۔ باقی میں کچھ آئندہ کے لئے غلہ اور روزمرہ کا خرچ چلا۔ وہ بھی اب اخیر ہو چلا۔ کیا کروں، کیا نہ کروں۔ خاموش اٹھا اور گھر سے نکل پڑا۔ اس ماحول سے جب ذرا باہر ہوا تو دماغ کا بوجھ ہلکا ہوا۔ اب طرح طرح کی ترکیبیں بھی سمجھ میں آنے لگیں۔ بی۔ ایس سی کے جوتوں کی دوکان میں اپنا پرانا شاگرد ہے۔ خدا بھلا کرے۔ خوب یاد آیا، ہمت کی اور جوتوں چپلوں کی ہم یوں ادھار پر سرکی۔ سویوں کے لئے راحت میاں سلامت رہیں۔ وہ کام بھی انجام پایا۔ کپڑوں کی دوکان کے مالک بھائی نصیر نے نصرت کی۔ چلو یہ معرکہ بھی سر ہوا۔ اشوک اسٹور، بچھم دروازہ کی قدیمی بڑی دوکان ہے۔ ہم بھی پرانے ہیں۔ پھر کیا تھا۔ رام بابو کی عنایتوں نے موزے اور بنیائن کے علاوہ دوسری متفرق چیزوں کا مسئلہ بھی حل کر دیا۔ اسی طرح اور دوسروں سے بھی ادھار کھاتہ چل گیا۔"

"محل خانہ کی سند کو مستند کرنے لوگ محلہ کے مولانا کی خدمت میں پہنچے اور دریافت کیا کہ "حضور! کل کے لئے کیا حکم ہے؟" مولانا نے پوچھا "کیوں بھائی چاند ہو گیا ہے" اور حضور نواب صاحب نے بھی اب تک کہیں سے تصدیق کرائی ہے یا نہیں؟" سبھوں نے ایک زبان ہو کر کہا "جی ہاں! ہمارے محلے میں سبھوں کے گھر میں چاند دیکھا گیا۔ چھوٹے

سرکار نے خود اپنی آنکھوں سے چاند دیکھا ہے۔" پہلے تو مولانا گھبرا گئے کہ یہ ہمارے محلے والا کیسا چاند ہے۔ لیکن بعد میں قائل ہونا پڑا اور شریعت کے کارخانہ میں فتویٰ ڈھل گیا۔ اس طرح دوسرے دن صبح کو معلوم ہوا کہ بغیر چاند کے عید ہو گئی۔"

عبدالمغنی

عبدالمغنی ابن سید عبدالرؤف کی پیدائش اورنگ آباد میں ۱۹۳۶ء کو ہوئی۔ آپ کی علمی لیاقت مدرسہ ایجوکیشن بورڈ سے عالم اور پٹنہ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی (انگریزی) ہے۔ ان دنوں بی۔ این کالج پٹنہ کے شعبہ انگریزی میں لکچرر ہیں۔ آپ نہ صرف ادب کے میدان میں آگے ہیں بلکہ مذہب اور سیاست میں بھی پیش پیش نظر آتے ہیں آپ کا پہلا مضمون "لفظ شہید اسلامی نقطۂ نظر سے" ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ آپ کی تخلیقات سیاسی، مذہبی اور ادبی مضامین ہیں۔ جو نقوش (لاہور) اردو ادب (انجمن ترقی اردو ہند) اور آج کل (دہلی) وغیرہ رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

نقطۂ نظر، جادۂ اعتدال، تشکیل جدید (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)، برناڈ شا، اختر اورینوی کے افسانوں کا انتخاب، آغا حشر کا ڈرامہ، سلور کنگ وغیرہ آپ کی مطبوعہ تصنیفات ہیں۔ "جادۂ اعتدال" پر بہار اردو اکاڈمی کی جانب سے تین ہزار روپئے انعام کی شکل میں مل چکے ہیں اقبال، غالب، کرشن چندر، اختر اورینوی اور آل احمد سرور آپ کے پسندیدہ

شعراء اور ادباء ہیں۔ ان دنوں انجمن ترقی اردو بہار اور حلقۂ ادب بہار (پٹنہ) کے صدر بھی ہیں۔ نمونۂ تخلیق میں آپ کے مضمون بعنوان "اردو کی عالمی حیثیت تسلیم شدہ ہے" کا ایک حصہ نقل کیا جاتا ہے:۔

اردو کو دورِ قدیم میں ہندوی بھی کہا جاتا تھا۔ اور غالب نے اپنے خطوط کے ایک مجموعے کا نام "خود ہندی" رکھا تھا۔ یہ تاریخی واقعات کس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں؟ یہ لوگ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اردو برابر ہندی کی شیلی رہی ہے۔ اور ہندی اصل زبان ہے۔ جس سے خواہ مخواہ انحراف کر کے اردو کی گویا بے اصل عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ لیکن تسلیم شدہ حقائق اس بیان کے بالکل برعکس صورتِ حال کی نشان دہی کرتے ہیں۔ جو حرف یہ ہے کہ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے دیوناگری ہندی نام کی کوئی زبان روئے زمین پر نہیں تھی۔ چنانچہ اس وقت سے پہلے ہندی ادب کی جن روایات کا ذکر کیا جاتا ہے وہ بعض پراکرتوں مثلاً اودھی کا سرمایہ ہیں اور ۱۸۰۰ء کے بعد ہی ہوا کہ ہندی کی شروعات ہوئی وہ بھی اس طرح کہ انیسویں صدی کے اواخر اور غالب کی وفات، ۱۸۹۶ء تک ہندی ادب کی ایسی کوئی روایت نہیں بنی تھی۔ جس سے ہندوستان کا کوئی طبقہ، حلقہ اور علاقہ حتیٰ کہ ہندو شمالی ہندوستان کے ہندو بھی آشنا ہوتے اس وقت تک ہندی، ہندوی، ہندوستانی اور ریختہ وغیرہ کے ناموں سے جو کچھ تھی اردو تھی یہی وجہ ہے کہ خود فورٹ ولیم کے ہندی ساز کارخانے میں بھی ایک عرصہ تک ہندی زبان و ادب کی تخلیق اردو رسم خط میں ہوتی رہی۔ اس لئے کہ ہندی اور دیوناگری کی مشق رکھنے والے ادیب پورے ملک میں ناپید تھے۔ لہٰذا واقعہ یہ ہے کہ ہندی کی پرورش اردو کی ایک ذیلی بھاشا کے طور پر اور شعبۂ اردو ہی کے تحت ہوئی (ان ناقابلِ تردید دستاویزی حقائق کی تفصیل کے لئے دیکھئے ہندو یونیورسٹی

کے شعبۂ اردو ڈاکٹر حکم چند نیر کی کتاب "اردو کے مسائل") ۱۸۳۶ء میں انگریزوں نے اردو کو ملک کی سرکاری زبان کیوں بنایا؟ اگر اردو ہندی کی شیلی ہوتی یعنی اصلی وعوامی زبان اردو کے بجائے ہندی ہوتی تو انگریز کبھی یہ سیاسی غلطی نہ کرتے کہ اردو کو دفاتر اور محکموں کی زبان بنائیں۔ انھوں نے بہت تفتیش اور غور وفکر کے بعد بالآخر اور بدرجۂ مجبوری اردو کو سرکاری حیثیت صرف اس لئے دی کہ وہی عملاً پورے ملک کی زبان تھی۔

اسلم آزاد

اسلم آزاد ابن محمد عباس کی پیدائش ۲۲ دسمبر ۱۹۴۷ء کو مولانگر میں ہوئی آپ کی علمی لیاقت ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی ہے۔

آپ کو شعر وادب سے لگاؤ عہد طفلی سے ہی رہا۔ آپ کی پہلی نثری تخلیق ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی۔ اور اسی سال انھوں نے رسالہ "اسباب" کا بھی اجراء کیا۔ اس کے بعد تنقیدی، تحقیقی مضامین کے علاوہ، افسانوں پر بھی مشق کی۔ نثر میں کسی سے اصلاح نہیں لی۔ البتہ شاعری میں وقتاً فوقتاً رضا نقوی واہی اور دیگر احباب شعراء سے مشورہ لیا۔ آپ کی تخلیقات آجکل، شب خون، تحریک، شاعر، تناظر اور شیرازہ جیسے رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ۱۹۶۷ء سے لے کر حال تک کے مضامین اور غزلیں ریڈیو سے بھی نشر ہو چکی ہیں۔ نشاطِ کرب (شعری مجموعہ) آنگن۔ ایک تنقیدی جائزہ، عزیز احمد بحیثیت ناول نگار اور اردو ناول آزادی کے بعد آپ کی مطبوعہ تصنیفات ہیں۔ نشاطِ کرب اور آنگن۔ ایک تنقیدی جائزہ پر بہار اردو اکاڈمی کی

جانب سے انعام بھی پا چکے ہیں۔ دیگر ادب نوازوں کی طرح آپ کے پسندیدہ شعرا اور ادبا غالبؔ، میرؔ، فیضؔ، اختر اورینوی اور رضا نقوی واہی وغیرہ ہیں۔ اندنوں آپ شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں مصروف درس و تدریس ہیں نمونۂ تخلیق میں آپ کے ایک مضمون بعنوان "ایک چادر میلی سی کا پلاٹ" کے چند اقتباسات منسلک ہیں:۔

راجندر سنگھ بیدی ان فنکاروں میں سے ہیں۔ جنھوں نے مخصوص صنفوں کے فنی تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ "ایک چادر میلی سی" میں بھی انھوں نے ناول کی قدروں کے فنکارانہ استعمال کے سلسلے میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ اس ناول کا پلاٹ بے حد مربوط اور منضبط ہے۔ اسلوب پر پنجابی اثرات نمایاں ہیں۔ مگر خوبی یہ ہے کہ پنجابی زبان کے جملوں اور فقروں کے استعمال کے باوجود عبارت کی روانی اور اس کے بیساختہ بہاو میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔

تشبیہوں اور استعاروں میں کبھی کبھی وہ ایسی باتیں بھی آسانی سے کہہ جاتے ہیں کہ جن کا اظہار حقیقتاً مشکل ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر فنکار بالعموم یا تو اسلوب کی گراوٹ کا شکار ہو جاتا ہے اور عریانیت سی پیدا ہو جاتی ہے۔ یا وہ بات ہی نہیں کہہ پاتا جو وہ کہنا چاہتا ہے۔ بیدیؔ کے اسلوب میں یہ نقص نہیں۔ نہ کسی قسم کی عریانیت ہے نہ ناہمواری۔ اس کے باوجود پلاٹ سے وابستہ نازک سے نازک تجربہ کا مکمل اظہار بھی ہے۔ منگلؔ اور رانو کے رشتوں میں ہمواری آتی ہے۔ اور ان دونوں کے تعلقات ہر جہت ایک مثبت رخ اختیار کر لیتے ہیں تو اس کا لازمی ردعمل بھی ہوتا ہے۔

---

(۲۷) سید علی محمد شاد عظیم آبادی ابن سید اظہار حسین عرف عباس مرزا کی پیدائش ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۶ء میں ہوئی اور وفات ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۹۲۷ء میں پائی۔ آپ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، غزل، قطعہ اور رباعی پر آپ کو بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ خاص طور سے تغزل میں آپ کی انفرادیت نظر آتی ہے

میخانہ الہام، مراثی و رباعیات، نالۂ شاد، ثمرۂ زندگی، مادرِ ہند، چشمۂ کوثر موصوف کی اہم تصنیفات ہیں۔

ع اب بھی اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا
زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا

(۲۸) سید امیر حسن خاں، ایجاد عظیم آبادی، شاد عظیم آبادی سے کے چھوٹے بھائی تھے ۱۳۱۹ھ میں انتقال کیا۔

ع لگے گا جی نہ کبھی سیر باغ رضواں سے
لیے چلیں گے دل داغدار ہم یاں سے

(۲۹) نواب سید تحمل حسین خاں عرف سید سلطان مرزا صاحب تخلص سلطان، خلف نواب بہادر سید ولایت علی خاں مرحوم تلمیذ صفیر بلگرامی ۱۹۳۹ء میں کم عمری میں انتقال کیا۔

ع رہ کے دنیا میں ادھر کچھ بھی نہ پایا سلطان
بعد مرنے کے خدا جانے ادھر کیا ہو گا

(۳۰) سید امداد امام (شمس العلماء) تخلص اثر ابن سید وحید الدین کی ولادت ۱۸۴۹ء کو بمقام سالار پور ضلع پٹنہ میں ہوئی۔ اور ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو آبگلہ ضلع گیا میں وفات پائی۔ فوائد دارین، مراۃ الحکماء، بہارِ سخن، کتاب الاثمار، کتاب الحر راحت، رسالہ طاعون، مصباح الظلم، مناظر المصائب، معیار الحق، فسانۂ ہیمت

عبارت کی بے تکلفی زبان کی سادگی جملوں کی برجستگی اور روانی بیدی کے طرزِ تحریر کی خصوصیات ہیں۔ اس کے اسلوب میں فنی طور پر اعتدال، سنجیدگی اور متانت ہے۔ اس کے ساتھ ہی پلاٹ میں کساوٹ پلاٹ سے وابستہ تمام واقعات میں ہم آہنگی ہے۔ واقعات کا جوڑ کہیں معلوم نہیں ہوتا۔ یہ واقعات آپس میں اس طرح مربوط ہیں کہ ان کے تنوع کے ساتھ ساتھ ایک قصہ بنتا چلا جاتا ہے۔ اتحاد اثر کی صفت بھی یہاں موجود ہے۔ اس صفت کو فنکار ناول کے پلاٹ میں شروع سے آخر تک نبھاتا ہے۔ تمام واقعات ایک بندھن میں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ پلاٹ کا کوئی واقعہ اپنا الگ اثر قائم نہیں کرتا۔ اس کے پلاٹ کی ایک اور خوبی اس کی معقول و مناسب تراش و خراش اور واقعات کی کفایت بھی ہے۔

بیدی کی مکالمہ نگاری بھی تخلیقی ذہانت کی حامل ہے۔ کرداروں کی گفتگو نہ خطابت بنتی ہے۔ اور نہ طوالت بیجا کا شکار ہوتی ہے۔ گفتگو میں ایک معقول مگر تیز لہر ہے۔ جو ناول کے پلاٹ میں ابتدا سے انتہا تک جاری و ساری ہے۔ ان مکالموں میں احساس اور جذبہ کی کرنیں موجزن ہیں۔ اور یہ شدتِ تاثیر سے لبریز ہیں۔ الفاظ کی اس درجہ کفایت اور ان میں اتنی تاثیر کسی دوسرے ناول نگار کے یہاں کم ہی نظر آتی ہے۔

قیصر رضا

قیصر رضا ابن سید رضا کی پیدائش ۱۵ ر مئی ۱۹۴۸ء کو شہر عظیم آباد (پٹنہ) میں ہوئی۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۶۱ء سے اس وقت ہوا۔ جب ان کی پہلی کہانی ہزاری باغ اسکول کے میگزین میں شائع ہوئی۔ اپنی ادبی زندگی میں تنقیدی مضامین اور افسانوں کے علاوہ اصنافِ سخن میں چند نظمیں بھی کہی ہیں، جو رسائل میں شائع ہوئیں۔ کئی افسانے اور مضامین ریڈیو سے بھی نشر ہو چکے ہیں۔ پسندیدہ فنکاروں میں ہر سچے فنکار کو قدر اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ فی الحال شہر پٹنہ کے محلہ باقر گنج میں سکونت پذیر ہیں۔ نمونۂ تخلیق میں آپ کے ایک تنقیدی مضمون بعنوان "تخلیق اور تنقید" کے چند اقتباسات یہ ہیں :-

مظفر حنفی[1] کا ایک خط میری نظر سے گذرا وہی خط دراصل اس مضمون کا محرک ہے۔ مظفر حنفی تخلیق و تنقید کو ایک ساتھ مانتے ہیں۔ وہ چولی دامن کا تو ساتھ بتاتے ہیں لیکن فیصلہ نہیں کر پاتے کہ ادبیت کسے حاصل ہے۔ ادب نہ تو سائنس ہے، نہ فلسفہ۔ یہ نہ ہی نفسیات ہے اور نہ معاشیات و عمرانیات۔ ادب صرف ادب ہے۔ ان سبھوں سے بالاتر، لیکن ادب

---

[1] مظفر حنفی کی پوری عبارت یہ ہے: "تنقید اور تخلیق میں کسے کس پر فوقیت حاصل ہے اس موضوع پر کافی بحث ہو چکی ہے۔ اور ہنوز طے نہیں ہو سکا کہ تنقید تخلیق کی پیرو ہے یا تخلیق تنقید کی۔ میرے اپنے خیال میں ہر دو اصناف کا چولی دامن کا ساتھ اور دونوں متوازی چلتی ہیں۔"

"شاعر" : جولائی ۱۹۶۷ء صفحہ ۶۸

اس وقت تک مکمل ادب نہیں ہوتا جب تک وہ ان سمجھوں کو لے کر ساتھ نہیں چلتا۔ خالی ادب کھوکھلا ہے۔ Air light بوتل کی مانند جس میں کچھ بھی نہیں۔ ادب اسی وقت ادب کہلاتا ہے جب اس میں کچھ ہو۔ چاہے وہ کچھ سائنس سے لیا گیا ہو یا فلسفہ و نفسیات سے یا مذہب سے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم ادب کی تخلیق ہی کیوں کریں؟ جب اس کی تخلیق ہمارے ذہن پر کوئی تاثر پیدا نہیں کرتی۔ تو پھر ادب کے جام کیوں لنڈھائے جائیں؟ جب یہ بیکار شے ہے تو اس کی طرف توجہ دے کر ہم اپنا قیمتی وقت اور سرمایہ کیوں برباد کریں؟ اس قسم کے سوالات ہمارے ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے ہمیں آدم کی تخلیق پر غور کرنا پڑے گا۔ خدا بہت بڑا خالق ہے۔ اگر اس نے آدم کی تخلیق نہ بھی کی ہوتی تو اس سے اس کی بڑائی پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ ہی اس کے دوسرے مشاغل میں خلل پڑتا۔ جہاں تک میرا خیال ہے انسان کی تخلیق کے بعد خدا کی پریشانیوں میں اور اضافہ ہو گیا ہو گا۔ لیکن جب بھی وہ انسان کو دیکھتا ہو گا تو اسے راحت اور طمانیتِ قلب میسر آتی ہو گی۔ اور وہ خالق اپنی تخلیق کو دیکھ کر تمام پریشانیوں کو بھول جاتا ہو گا۔

تخلیق کیوں ضروری ہے۔ بظاہر بچے پیدا ہونے اور عمل میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔ بچے نہ پیدا ہوں تو بھی دنیا کے کام کاج چلتے رہیں گے۔ لیکن ان کا پیدا ہونا بھی ضروری ہے۔ انسان ایک لاولد جوڑے کو دیکھ کر اندازہ کر سکتا ہے۔ جہاں ہر لمحہ عورت کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ایک تخلیق ہو۔

اب باری آتی ہے تنقید کی ــــ کہ بچہ کیسا ہے ؟۔ گورا یا کالا، کہیں لنگڑا لولا کانا تو نہیں۔ پھر بہرے پن پر بھی غور کیا جاتا ہے۔ جب وہ کچھ بڑا ہوتا ہے تو اس کی زبان پر دھیان دیا جاتا ہے کہ بچہ گونگا تو نہیں۔ جب اور بڑا ہوتا ہے تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ ذہین ہے یا غبی۔ پھر جب وہ جوانی کی سرحدوں پر قدم رکھتا ہے تب اس بات پر نظر رکھی جاتی ہے کہ اس کے عادات وخصائل کیسے ہیں۔ انھیں سب باتوں پر جب تنقید کی جاتی ہے تو اسے ہم تنقید کہتے ہیں۔ تنقید کا مطلب ہے خوبیوں کے ساتھ ساتھ جو خامیاں موجود ہوں اس کا بھی ذکر کیا جائے کہ کس معاملہ میں وہ کیسا ہے؟ پھر نسخہ بتایا جائے کہ اس کی خامیاں کس طرح دور ہوں۔

سائیکل بننے کے بعد ہی سواری کا زمانہ آتا ہے۔ قبل سائیکل بننے کے آدمی سائیکل چلانا سیکھ نہیں گیا تھا۔ اس طرح قبل تخلیق، تنقید نہیں۔ تخلیق کے بعد ہی تنقید کا دور آتا ہے۔ اور تب تنقید یہ تنقید کہ مثبت تھی یا منفی۔ یعنی سائیکل کے بعد سواری پھر سواری کے طریقہ پر غور۔ تخلیق کے عمل میں آنے کے فوراً ہی بعد تنقید شروع ہو جاتی ہے۔ یا یوں کہئے کہ تنقیدی عمل شروع ہو جاتا ہے۔ تنقید دراصل دو چار کمپنیوں کے مال آپ کے سامنے رکھ دیتی ہے۔ پھر ایک ایک کمپنی کے مال کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ وہ اس سامان کی خوبی اور خامی پر روشنی ڈالتی ہے۔ اسے جانچتی ہے ان تمام باتوں کے بعد وہ ایک فیصلہ کرتی ہے۔ وہ اس کا اپنا فیصلہ ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو اس فیصلہ سے اختلاف ہو۔

اعجاز علی آرشد

اعجاز علی ارشد ابن محمد علی خاں کی پیدائش یکم جنوری ۱۹۵۴ء کو دیوان محلہ پٹنہ سٹی میں ہوئی۔ ۱۹۶۷ء میں محمڈن اسکول پٹنہ سٹی سے میٹرک پاس کرنے کے بعد ۱۹۷۱ء میں اورینٹل کالج پٹنہ سٹی سے بی۔ اے آنرس اور ۱۹۷۳ء میں ایم۔ اے (اردو) اور پھر ایم۔ اے (فارسی) مکمل کیا۔ اور ادھر پی۔ ایچ۔ ڈی بھی مکمل کر چکے ہیں۔

لکھنے کا شوق اسکول کے زمانے سے ہی رہا۔ اس سلسلے میں اسکول کے استاد محترم جناب ناصر زیدی صاحب کی رہنمائی دیگر طالب العلموں کی طرح ان کے ساتھ بھی ہوئی۔ شاعری کا شوق جناب ہوش عظیم آبادی کی رہنمائی میں پروان چڑھا۔ جس کی بنا پر قصیدہ گوئی، مرثیہ گوئی کے علاوہ ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی۔ نثر میں خاص طور سے ادبی تنقیدی مضامین، انشائیے اور کچھ افسانے بھی لکھے ہیں۔ جو شاعر، صبح نو، شگوفہ، بہار کی خبریں، آبشار اور زبان و ادب کے علاوہ دیگر جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔ اور ریڈیو پٹنہ سے بھی نشر ہو چکے ہیں۔ پچھلے کئی برسوں سے ایک ظریفانہ اخبار بنام مگدھ پنچ (پندرہ روزہ) بھی نکالتے ہیں۔ انھوں نے بہار کے مستند شاعر جناب زار عظیم آبادی کے مجموعہ کلام بنام "نشاطِ غم" کو مرتب کر کے بہار اردو اکاڈمی کے مالی اعانت سے شائع کیا۔ ادھر ان کی ایک تصنیف "بہار میں اردو تنقید" منظر عام پر آگئی ہے۔ فی الحال پٹنہ یونیورسٹی کے بی۔ این کالج پٹنہ کے شعبۂ اردو میں مصروف درس و تدریس ہیں۔

نمونۂ تخلیق میں آپ کے انشائیہ بعنوان "ہڑتال" کے چند اقتباسات

منسلک ہیں :۔

"ہڑتال" کیا ہے؟ اور یہ لفظ کہاں سے آیا؟ ضروری ہے کہ پہلے اس پر غور و فکر کریں اور دیکھیں کہ اس کو موجودہ دور میں آخر اتنی مقبولیت کیوں حاصل ہے؟

ہڑتال اپنی "ڑ" کی وجہ سے خالص ہندوستانی لفظ معلوم ہوتا ہے لیکن کبھی "ڑ" کو چھوڑ کر "ر" کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ جیسے نہ چونا لگے نہ ہرتال، رنگ چوکھا آئے۔ یہاں پر "ہرتال" ایک معدنی دھات ہے۔ جو زرد رنگ کی ہوتی ہے مگر اب یہ بھی ہڑتال ہی مستعمل ہے۔ بہرحال ہمارے پیش نظر چونے کی ہرتال نہیں بلکہ موجودہ سماج میں ہونے والی آئے دن لوگوں کی ہڑتال ہے۔ جس میں چہل پہل بڑھ جاتی ہے۔ سڑکوں پر لوگوں کے جتھے نظر آتے ہیں۔ اور بازار بند ہو جاتے ہیں۔

ہم سبھی جانتے ہیں کہ تین طرح کی ہٹیں یعنی "بال ہٹ" "تریا ہٹ" اور "راج ہٹ" مشہور بھی ہیں۔ اور بڑی خطرناک بھی۔ لیکن ان سب سے زیادہ خطرناک ایک اور ہٹ ہے۔ جسے کبھی "تال ہٹ" کہا جاتا ہوگا لیکن مدتوں استعمال میں آتے یہ پہلے "ہٹ تال" اور پھر ہڑتال ہو گئی۔

مجنوں نے فراق لیلیٰ میں جو کھانا پینا چھوڑ دیا تھا تو یہ بھی شاید ایک قسم کی بھوک ہڑتال ہی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ مجنوں کی بھوک ہڑتال کامیاب نہ ہوئی، لیکن یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ مجنوں بیچارہ سچا ہڑتالی تھا۔ آج کل کے ہڑتالیوں کی طرح نہیں کہ جس کو ذرا شہرت اور ناموری کا شوق ہوا، اس نے بھوک ہڑتال

شروع کر دی۔

ہڑتال کی تاریخ بڑی پرانی ہے۔ دراصل یہ بنی نوع انسان کی اپنی تاریخ کی طرح پرانی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بدلتے ہوئے ادوار میں اس کی شکلیں بدلتی رہی ہیں۔ مجھے ان بدلتی ہوئی شکلوں سے بحث نہیں بلکہ مجھے تو موجودہ دور کی صرف ان ہڑتالوں سے مطلب ہے۔ جن میں ہوش کم اور جوش زیادہ ہوتا ہے۔

چوہا بلی سے ڈرتا ہے۔ بلی کتے سے ڈرتی ہے۔ کتا شیر سے اور شیر آدمی سے۔ مگر اب انسان بھی ایک چیز سے ڈرتے ہیں اور وہ ہے ہڑتال۔ غریب ہے تو اس کو ہڑتال سے روزی بند ہونے کا خطرہ۔ امیر ہے تو دولت جانے کا خطرہ۔ کارخانہ دار ہے تو کارخانے میں تالا پڑ جانے کا خطرہ اور منسٹر ہے تو کرسی سے نیچے آنے کا خطرہ ہمیشہ لگا رہتا ہے۔ یعنی ادھر ہڑتال ہوئی اور مرزا خیراتی سے لے کر سیٹھ نکاتی تک ہزاروں لوگ پریشان۔

مشکل تو یہ آپڑی ہے کہ یہ بڑی بی (بی۔ ہڑتال) اب ہمارے اور آپ کے گھروں میں بھی اپنے قدم جمانے لگی ہیں۔ ابھی چند ہی دنوں کی بات ہے کہ ہم بیگم صاحبہ کو ساتھ لئے بغیر سنیما چلے گئے بس جناب غضب ہو گیا۔ واپس آتے ہی انٹی میٹم مل گیا، کل سے باورچی خانہ میں ہڑتال رہے گی۔ وہ تو کہئے کہ اسی بیچ ان کی چند سہیلیاں آگئیں۔ بیگم کا موڈ کچھ اچھا ہوا اور ہم نے موقع غنیمت جان کر ایک کے بدلے دو پکچر دکھانے کا وعدہ کر کے یہ باورچی خانہ کی ہڑتال رکوائی۔

افسانہ نگار

محمد محسن

ڈاکٹر سید محمد محسن۔ مولد و مسکن عظیم آباد، پٹنہ کی پیدائش ۲۳ جولائی ۱۹۱۰ء کو ہوئی۔ ۱۹۴۴ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے اول درجہ میں ایم۔اے کرنے پر طلائی تمغہ حاصل کیا۔ ۱۹۳۸ء میں گورنمنٹ پٹنہ کالج میں فلسفہ کے لکچرر کی حیثیت سے تقرری ملی۔ ۱۹۴۸ء میں اڈنبرا یونیورسٹی سے نفسیات میں ڈاکٹر کی سند حاصل کی۔ ۱۹۵۶ء میں دو کیشنل گائڈنس بورڈ کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ اور ۱۹۶۵ء سے پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ نفسیات کے صدر کے فرائض انجام دینے کے بعد اب ریٹائر ہو گئے ہیں۔

آپ نفسیات کے پروفیسر اور ماہر نفسیات کے لحاظ سے برصغیر میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ نثر میں تنقیدی مضامین اور نفسیاتی کہانیاں لکھتے ہیں۔ اس کے ماسوا شعر و شاعری سے بھی کافی دلچسپی ہے۔ یوں ان کی کہانیوں کی تعداد کم ہے۔ لیکن معیار کے لحاظ سے یہ کہانیاں بلند مقام کی حامل ہیں افسانوی مجموعہ میں "انوکھی مسکراہٹ" اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ "نفسیاتی زاویئے" منظر عام پر آکر داد تحسین وصول کر چکے ہیں۔ نمونۂ تخلیق میں آپ کے افسانہ "جھوٹی بھوک" کے چند خاص اقتباسات منسلک ہیں:۔

اسے تو من کا روگ تھا۔ اس کے من میں ایک طوفان سا اٹھتا رہتا ایک مستقل اضطراب کی کیفیت! وہ اندر ایک تڑپتی ہوئی بھوک سنا کرتا تھا۔ جیسے خلا میں کسی چیز کے گرنے سے ایک تھرتھراتی ہوئی آواز پیدا ہو جاتی ہو، دوستوں کی صحبت میں جب مزہ مزہ کی باتیں ہوتی رہتیں، حسن عشق کے قصے دہرائے جاتے اس وقت بھی اس کے کان، اس کے دل کی

آواز پر لگ جاتے۔ جیسے سنسان میدان میں کوئی دور سے اسے پکارنے لگا ہو۔ اس کا خیال ہٹ جاتا۔ اور وہ کھویا کھویا سا نظر آنے لگتا۔

وہ ایک شام کافی دیر تک کھلے میدانوں کے چکر کاٹ کر گھر لوٹ رہا تھا۔ اور گھر کے پھاٹک میں قدم رکھا ہی چاہتا تھا کہ اس کی نگاہ بغل کے کوٹھے پر پڑی۔ ایک کمسن لڑکی کوٹھے کے برآمدہ پر کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں دو چار ہو کر شرما گئیں۔ وہ اسے ہی تکتی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی۔

وہ گھر والوں کی آنکھیں بچا کر دیوار کی پشت سے لگ کر کھڑا ہو جاتا اور اسے دیکھنے لگتا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اس کے دل کے اندھیارے میں کرن پھوٹ گئی ہو۔ جیسے اس کے من کی آواز فضا میں کھو جانے کے بجائے گونجتی ہوئی اس کے پاس لوٹ آنے لگی ہو۔ رفتہ رفتہ اس کا جی صرف نظروں کی تسکین سے اکتا گیا۔ اور گفتگو کی آرزو اس کے دل میں کروٹ لینے لگی۔

وہ ہفتہ میں دو دن رانو کے گھر جاتا اور انہماک سے اسے پڑھاتا یہاں تک کہ رانو کا امتحان ختم ہو گیا۔ اور رانو کے گھر جانے کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی۔ لیکن جب امتحان کے بعد رانو کے یہاں جانے والا دن پہونچا تو اسے بڑی بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ جیسے اس کی زندگی میں ایک گہرا خلا پیدا ہونے والا تھا۔ اس کا جی بار بار چاہ رہا تھا کہ اس شام کو بھی رانو کے پاس جائے۔ لیکن اس نے اپنی طبیعت پر قابو پانے کی کوشش

رسالۂ نبل، سوانح عمری حضرت مخدوم الملک بہاری (انگریزی)، سوانح عمری مکہ معظمہ وکٹوریہ (اردو)، دیوان اثر (فارسی)، ترجمہ انشار لارڈ بیکن (فارسی)، دیوانِ اثر (اردو)، رسالہ جر ثقیل (فارسی)، رسالہ کلیات، رسالہ علم حرکت، رسالہ امراد المناظر (فارسی) اور کاشف الحقائق آپ کی تصنیفات ہیں۔

؎ مجھ پہ تا چند رہے گی تری بیداد، بتا
جور کی حد بھی ہے آخر ستم ایجاد بتا

(۳۱) سید خورشید نواب تخلص خورشید خلف نواب سید احمد حسین خاں ۱۲۷۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۳۳ھ میں وفات پائی۔

؎ دم لبوں پر آگیا خورشید کا اس ہجر میں
رو کتا ہے یار کو لے ناز تو کیونکر بنے

(۳۲) بشارت حسین، تخلص احقر ضلع عظیم آباد کے ایک گاؤں بڑا ڈیہہ (جو عرف عام میں بڑاری کے نام سے مشہور ہے) میں ۱۲۷۶ھ میں پیدا ہوئے آپ کے والدِ ماجد شیخ ذکر حسین فطری شاعر تھے۔

؎ آئی خزاں بہار کے دن اب ہوا ہوئے
احقر شباب سا نہیں پیری میں رنگ سرخ

(۳۳) محمد اظہر احسن تخلص شوق ابن شیخ سبحان علی (موضع نیمی ضلع پٹنہ) ۱۲۷۸ھ میں پیدا ہوئے۔ اصناف سخن میں حضرت استاد شمشاد کے شاگرد تھے۔ نغمہ راز، سوز و گداز (مثنوی) یادگار وطن (غزلوں کا دیوان) اور ازاحۃ الاغلاط (عربی و فارسی غلط الفاظ کی تحقیقات کی کتاب) موصوف کی اہم تصنیفات ہیں۔

؎ عیش اے شوق تم بے سمجھے بوجھے آہ کر بیٹھے
تمہیں دیکھو وہ بیتابی سے کس مشکل میں رہتے ہیں

کی اور سنیما جانے کے ارادہ سے گھر سے نکلا۔ مگر وہ غیر ارادی طور پر رانو کے مکان میں داخل ہو گیا۔ جیسے اس کے پاؤں بہک گئے ہوں یا ان پر کسی دوسرے کا قبضہ ہو گیا ہو۔

اس رات وہ گھر لوٹا تو سول میرج کا خیال اس کے دماغ میں دیر تک چکر کاٹتا رہا۔ "شاید رانو مجھ سے سول میرج کرنے کو تیار ہے۔" اس کے چہرے پر چمک پیدا ہو گئی۔ وہ پہلے ہی سے رانو کی گفتگو میں پریم کا رس محسوس کر چکا تھا۔ اسے اب کامل یقین تھا کہ رانو اس سے اتھاہ محبت کرنے لگی تھی۔ وہ اس کی خاطر ہر مشکل کو جھیلنے کو تیار تھی۔ خود اس کا دل بھی تو رانو کے لئے بیتاب رہتا تھا۔ اس کی زندگی کا خلا تو رانو کے وجود سے ہی پر ہوا تھا۔ اس کی تڑپتی ہوئی ساحل نا آشنا زندگی رانو ہی کی بدولت تو ٹھہری ہوئی تھی۔

"میں لوٹ جانے کو نہیں آئی ہوں۔"

"تو پھر؟"

"آپ سب کچھ جانتے ہیں، آپ ہی نے تو مجھے سب کچھ بتایا ہے۔" اس کی آواز بیٹھنے لگی۔

"تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔"

"نہیں، آپ سب کچھ سمجھ رہے ہیں۔" رانو نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

وہ اسے دیکھ کر ڈر گیا۔ "جاؤ ورنہ میں شور کروں گا، جاؤ! جاؤ!"

"کمینے۔"

رانو چلی گئی۔ کمینے اس کے دماغ میں دیر تک گونجتا رہا۔ جیسے کائنات کا ذرہ ذرہ اسے پکار کر کہہ رہا ہو کمینے!

اختر اورینوی

سید اختر احمد اصلی نام، اختر اورینوی ادبی نام (اورینوی وطنی نسبت ہے) ابن سید وزارت حسین، ماہ اگست ۱۹۱۰ء کو کاکو میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی درس والدہ ماجدہ سے حاصل کیا۔ قرآن شریف مع ترجمہ، اردو، فارسی اور انگریزی وغیرہ کی تعلیم والد بزرگوار اور چچا جان سے حاصل کی۔ مونگیر ضلع اسکول سے ۱۹۲۶ء میں میٹریکولیشن فرسٹ ڈویژن سے پاس کر کے وظیفہ حاصل کیا۔ ۱۹۲۸ء میں آئی۔ ایس۔ سی سائنس کالج پٹنہ سے سکنڈ ڈویژن سے پاس کیا۔ اس کے بعد ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے پہلے سال میں داخلہ لیا اور پھر ۱۹۲۹ء میں اسے پاس کر کے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے دوسرے سال میں آئے۔ اس کے بعد پٹنہ کالج میں بی۔ اے آنرز انگریزی کے ساتھ ۱۹۳۲ء میں شاندار کامیابی حاصل کر کے گولڈ میڈل اور کتابوں کا انعام حاصل کیا۔ ۱۹۳۶ء میں اردو سے ایم۔ اے فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔ پٹنہ کالج میں ۱۹۳۸ء میں بحیثیت اردو لکچرر آئے۔ ۱۹۵۲ء میں پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے ایک پر مغز مقالہ لکھ کر ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔

آپ میں ایک بلند پایہ افسانہ نگار ہونے کی صلاحیت فطری طور پر موجود تھی۔ آپ اوّل اور آخر افسانہ نگار ہیں بعد میں شاعر، ڈرامہ نگار اور ناقد

آپ کی انشائیہ نگاری اپنی حلاوت، دلکشی اور جاذبیت کے لئے مخصوص ہے
موصوف کی مطبوعہ تصنیفات کی فہرست یوں ہے: ڈرامہ شہنشاہِ حبشہ
(۱۹۳۸) افسانوی مجموعے۔ منظر و پس منظر (۱۹۴۰)، کلیاں کانٹے (۱۹۴۱)،
انارکلی اور بھول بھلیاں (۱۹۴۴)، سیمنٹ اور ڈائنامائٹ (۱۹۴۷)، کیچلیاں اور
بالِ جبریل (۱۹۶۰)، ناول۔ حسرتِ تعمیر (۱۹۶۱)، تنقیدی مجموعے۔ قدر نظر
(۱۹۵۶)، تحقیق و تنقید (۱۹۶۲)، تحقیقی تصنیف۔ بہار میں اردو زبان و ادب
کا ارتقاء (۵۸-۱۹۵۶)، شعری مجموعہ۔ انجمن آرزو (۱۹۶۷) اور دیگر تصانیف
میں کسوٹی، مطالعہ اقبال، مطالعہ نظیر اور سراج و منہاج وغیرہ ہیں۔ آپ
کی تاریخ وفات ۳۰-۳۱ مارچ ۱۹۷۸ء ہے۔ نمونۂ تخلیق میں آپ کے افسانہ
"جینے کا سہارا" کے چند اقتباسات یہ ہیں:-

وہ کسی سے بھیک نہیں مانگتی تھی۔ بلکہ اپنے حال میں گرفتار گٹھری بنی
ہوئی ہلتی جلتی گنگناتی آہستہ آہستہ آگے بڑھتی جاتی تھی۔ دن بھر میں
وہ گلیوں اور بھرے بازار کا سفر کر لیتی تھی۔ اسے بہت کم بھیک ملتی تھی۔ فقیرن
کے حال کی یکسانی ایسی روزانہ کی بات ہو گئی تھی کہ لوگوں کی توجہ بھی اس طرف
نہیں پھرتی تھی۔ اسے دیکھ کر میں سوچتا کہ اس کی زندگی میں کیا کشش ہے کہ
جیے جاتی ہے۔ اس کے جینے کا کیا سہارا ہے۔ میری سمجھ میں نہ آتا، بے مقصد
زندگی زندگی نہیں۔ زندگی کی تہمت ہے۔ فقیرن کی زندگی بے کیف، بے آسرا،
روکھی پھیکی اور سپاٹ ہی نہ تھی۔ بلکہ دکھ، درد اور روگ سے بھری ہوئی
تھی۔ پھر بھی وہ جیے جاتی تھی۔ وہ زندہ رہنے کی کوشش کرتی۔ اس کی زندگی
میں حرکتِ پیہم تھی، استقلال تھا۔ شاید جینا خود ایک مقصد ہے۔

وہ ایک بوڑھے فقیر کی بیٹی تھی۔ اس نے اپنی ماں کو نہ دیکھا تھا۔ وہ

اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ اسی شہر میں بھیک مانگا کرتی تھی۔ دن بھیک مانگتے گذر جاتے اور راتیں کلکٹری، کچہری کے برآمدے یا کسی پیپل کے درخت تلے بسر ہو جاتیں۔ پہرے دار انھیں بہت ستاتے تھے۔ گرمی کی راتیں کھلے میدان میں گذاری جا سکتی ہیں مگر برسات اور جاڑے کی راتیں بڑی بیرن ہوتی ہیں۔ انھیں دشمن راتوں کو کاٹنے کے لئے کسی پناہ کی جگہ کی ضرورت ہوتی۔ پہرے داروں کو کچھ دے دلا کر ایسی جائے امن میسر آجاتی تھی۔ وہ اب جوان ہو چلی تھی اور زندگی کے دکھوں کو زیادہ محسوس کرنے لگی تھی۔ کبھی کبھی وہ جوانی کے سنہرے خواب دیکھتی اور ترس ترس کر رہ جاتی۔ کچھ دنوں سے ایک نوجوان پہرے دار ان پر بہت مہربان تھا۔ وہ بغیر پیسے لئے انھیں کچہری کے برآمدے میں سونے کی اجازت دے دیتا تھا۔ اور گاہے گاہے رات گئے ان کے پاس آبیٹھتا تھا۔ وہ انھیں اپنی دلاوری اور جیالے پن کے قصے سناتا تھا۔ چوروں کو پکڑنے کے قصے، ڈکیتوں کو گرفتار کرنے کے واقعات، بلوؤں پر گولیاں چلانے کی واردات۔ فقیرن پہرے دار سے مانوس ہو جاتی تھی۔ اور جب کبھی وہ پہرہ کی تبدیلی کے سبب نہ آتا تو وہ اداس رہتی تھی اور اس کی راتیں بڑی بے چین کٹتیں۔ بھری برسات کی ایک سنکتی ہوئی ظالم رات کو فقیرن کی جوانی کا سہانا خواب حقیقتِ عریاں بن گیا۔ وہ دن بڑے مزے میں کٹ رہے تھے۔ چند مہینوں کے بعد پہرے دار کہیں چلا گیا۔

بھکارن چھپریل میں داخل ہوئی۔ پلّے کے پاس پہنچی اور اپنی ساڑی کے آنچل سے بندھی ہوئی ہڈیاں اس کے سامنے کھول دیں۔ پلّہ غراتا ہوا بوڑھیا کے آنچل سے ہڈیاں کھاتا رہا۔ فقیرن نے دوسری پوٹری سے

روٹیوں کے کنارے نکال کر پلّے کو دیئے۔ اور خود اس سے پیار کی باتیں بولتی رہی۔ میں کھڑا ہوا یہ سارا ماجرا دیکھتا رہا۔ جب بھکارن پلے کو کھلا چکی تو اس نے خود کچھ کنارے کھائے۔ اور اس کے بعد پلے کو کھونٹی سے کھول کر گود میں لے لیا۔ اور بچھی ہوئی پیال پہ جا کر اسے پہلو میں لئے لیٹ گئی۔ بھکارن کچھ لوریاں سی گاتی جا رہی تھی۔ اور پلّہ آغوش کی گرمی کے مزے لیتا ہوا غوں غوں کر رہا تھا۔ میں یہ سوچتا ہوا آگے بڑھ گیا کہ شاید پلہ ہی بے آسرا بھکارن کے جینے کا سہارا ہے۔

سہیل عظیم آبادی

سید مجیب الرحمٰن اصلی نام، سہیل عظیم آبادی ادبی نام، ابن سید حبیب الرحمٰن کی پیدائش ۱۹۱۱ء کو پٹنہ کے ایک زمیندار گھرانے میں ہوئی۔ ابتدا میں مذہبی تعلیم پائی پھر انگریزی تعلیم کے لئے کلکتہ گئے جہاں اخباروں کے دفاتر میں کچھ عرصہ تک کام بھی کیا۔ پھر ۱۹۳۶ء میں واپس پٹنہ آئے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے قائم کردہ اردو مرکز چھوٹا ناگپور میں انچارج کے عہدہ پر کافی عرصہ تک اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۹۵۵ء میں آل انڈیا ریڈیو میں پروڈیوسر مقرر کئے گئے۔ پہلے سری نگر، پھر دہلی رہنے کے بعد آخر میں پٹنہ آئے ۱۹۷۰ء میں آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ بہار اردو اکاڈمی میں بھی کافی عرصہ تک رہ کر اردو کی خدمت کی۔ ان کی اردو کی سب سے بڑی خدمت تو یہ تھی کہ رانچی جیسے سنگلاخ علاقہ میں کافی اذیت اٹھانے کے باوجود یہاں رہ کر اردو کا چراغ روشن کیا۔ شروع میں شاعری کی

طرف راغب ہوئے۔ لیکن پھر اسے ترک کر کے افسانہ نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ نے افسانوں کے علاوہ فیچر، ڈرامے اور بچوں کے لئے بیشمار کہانیاں لکھی ہیں۔ جن میں آپ کی کہانیاں ہندوستان، پاکستان کے علاوہ روس، امریکہ، فرانس، چیکوسلاویہ، اٹلی اور دیگر ممالک کے ممتاز رسائل میں شائع ہوئیں۔ مختلف رسائل کی ادارت سے بھی وابستہ رہے آپ کی کہانیوں کے تین مجموعے "الاؤ"، "نئے پرانے" اور "چار چہرے" کے علاوہ ایک ناولٹ "بے جڑ کے پودے" منظرِ عام پر آکر دادِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔

آپ کے افسانے پر لطف اور حقیقت سے قریب ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سلیس زبان اور سیدھی سادی ٹکنک ہے۔ وقار عظیم لکھتے ہیں کہ:۔

"سہیل کے طنز میں تلخی نہیں ہے اس میں ادبیت ہے۔ لیکن شاعرانہ خلو نہیں۔ زندگی کی سچائی ہے لیکن بھیڑ بھاڑ نہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں احساس کو تیز بنا کر اسے زیادہ سے زیادہ ہلکا اور نرم کر کے فن کو اپنایا ہے۔ ان کے افسانے زندگی کے اضطراب، لیکن ان کے سکون کے پیامی ہیں۔"

افسوس اس عظیم افسانہ نگار اور عظیم انسان کی وفات سفر کے دوران الہ آباد میں ۲۹ نومبر ۱۹۷۹ء کو ہوئی۔ جس کی خبر پورے ہندوستان میں ریڈیو اور اخبار کے ذریعہ دی گئی۔ نمونۂ تخلیق میں آپ کے افسانہ "پیٹ کی آگ" کے چند اقتباسات منسلک ہیں:۔

غریب رحیم دن بھر کا تھکا ہارا اور بھوکا تھا۔ رات اتنی جا چکی تھی مگر وہ ابھی بجلی کے ایک کھمبے سے لگا کھڑا تھا۔ کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کے بدن پر پھٹے اور میلے کپڑے تھے۔ جن کو چھیدتی ہوئی ٹھنڈی ہوا اس کے بدن

میں گھس رہی تھی۔ شبنم کی دھیمی دھیمی پھوار پڑ رہی تھی۔ اور اس کے کمزور بدن کو ٹھنڈا کر رہی تھی۔

بیچارہ رحیم بھوک اور ٹھنڈک کو دلاسا دینے کے لئے بدن چرا کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا آخر کیا ہو گا؟ لیکن کچھ سوچ نہ سکا۔ غریب بیوی کی یاد نے اس کو بے چین کر دیا۔ جس نے چلتے وقت بار بار کہا تھا کہ جیسے بھی ہو کچھ روپیہ ضرور بھیج دینا۔ اس کی مرجھائی ہوئی جوانی اور پھیکا چہرہ، سوکھے ہوئے بدن اور پھٹے ہوئے کپڑوں کی یاد آئی، اور کسمسا کر رہ گیا۔ پھر سوچنے لگا وہ اتنے بڑے شہر میں ایک ہفتہ سے آیا ہوا تھا، لیکن کچھ نہ کر سکا۔ گھر بھیجنا تو ایک طرف اپنے کھانے پینے کا سامان بھی نہ کر سکا۔

ایک بابو نے اکڑ کر پوچھا: "ارے تم مزدور ہو؟"
رحیم نے بڑی امید کے ساتھ جواب دیا: "جی ہاں سرکار"
بابو صاحب بولے: "تیری ٹوکری کہاں ہے؟"
اس نے جواب دیا: "سرکار میرے پاس ٹوکری نہیں ہے۔"
بابو صاحب نے منھ سے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا:
"تو میرا کام تجھ سے نہیں چلے گا۔ میرے پاس سامان زیادہ ہے۔"
اس نے کہا: "میں اپنی چادر میں باندھ کر سامان پہنچا دوں گا۔"
مگر بابو صاحب نے ایک دوسرے مزدور کو آواز دی۔ یہ آگے بڑھ کر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ آنے والے مزدور نے اس کو گالی دی اور دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا۔ اور ساری ترکاری اپنی ٹوکری میں اٹھا کر چلتا بنا۔

تھوڑی دور گیا تھا کہ ایک عورت دکھائی دی۔ اس کے پاس کافی سامان تھا، اور وہ اس کو مشکل سے اٹھائے چلی آرہی تھی۔ ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بکس تھا۔ رحیم اس کے پاس گیا اور بولا: لاؤ ماں میں پہونچا دوں جو جی میں آئے دے دینا۔" یہ کہہ کر اس نے بکس کی طرف ہاتھ بڑھایا عورت نے جھٹکے کے ساتھ بکس کو کھینچ لیا۔ اور بگڑ کر بولی:

"الگ رہ۔"

بکس سے جھن کی آواز آئی۔ رحیم کے دل میں بہت سی باتیں تیزی کے ساتھ آئیں اور نکل گئیں، دل نے پلک مارتے ہی بہت سی کروٹیں لے لیں۔ اس کا ہاتھ پھر بکس پر مضبوطی سے پڑا۔ عورت کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کے ہاتھ میں آگیا۔ عورت کے منھ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی ــــــ

"چور..... ....."

شکیلہ اختر

شکیلہ اختر بنت شاہ محمد توحید، ۱۶ اگست ۱۹۱۶ء کو موضع اردل ضلع گیا میں پیدا ہوئیں۔ آپ کی تعلیم و تربیت دونوں گھر پر ہوئی۔ باقاعدہ آپ کی ادبی زندگی ۱۹۳۱ء سے شروع ہوئی۔ تخلیقی ادب، تاریخ ادب اور دینیات کا اچھا مطالعہ ہے۔ اردو کے مشہور ادیب ڈاکٹر اختر اورینوی مرحوم کی شریکِ حیات ہیں۔ آپ ایک کامیاب افسانہ نگار ہونے کے علاوہ ایک اچھی نظم نگار بھی ہیں۔ آپ کی بہت سی نظمیں اکثر مؤثر جرائد میں شائع ہوئی ہیں۔ لیکن اب شاعری کا شوق نہیں رہا۔ ان دنوں صرف افسانہ لکھتی

ہیں۔ سفر، پھول اور باغبانی کا انھیں بے حد شوق ہے۔ آپ کے افسانوں کے مجموعے آنکھ مچولی، درپن، ڈائن اور لہو کے مول وغیرہ منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ کچھ تصنیفات پر بہار اردو اکاڈمی کی جانب سے انعام بھی پاچکی ہیں۔ پچھلے کئی برسوں سے مستقل طور پر شہر پٹنہ میں سکونت پذیر ہیں۔ نمونۂ تخلیق میں ان کے ایک افسانہ بعنوان "خلش جو دل میں ہے" کا ایک اہم حصہ پیش ہے جو نہ صرف تخیلانہ فکر ہے بلکہ ایک احتجاج بھی ہے:

یہ حسین دنیا، یہ نیلا آسمان، جگمگاتے ہوئے ستارے، آفتاب کا روشن چہرہ اور چاند کی ٹھنڈی سیمیں چاندنی، لہلہاتے ہوئے سبزے، رنگینیاں لٹاتے ہوئے پھولوں کی چمن در چمن مست دبے خود بنا دینے والی خوشبوئیں، پروائی کے لطیف جھونکے، ساون کی بہاریں، چڑیوں کے بول۔ پیارے پیارے، معصوم، ہنستے، کھلکھلاتے بچے۔ خوابوں، تمناؤں اور پیار میں ڈوبے ہوئے رنگین جذبوں کی آرزوئیں کرنے والے نوجوان اور زندگی کی دہلیز پر کھڑے ہو کر اپنے بچوں کے ارمانوں کو پورا کرتے ہوئے دیکھنے اور انتظار کرنے والے لوگ۔ سبھی بے قصور و بے خطا آگ کی بھٹی میں اچانک جھونک دیئے جاتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ ایک ملک کی ہوس پوری ہو۔ یہ جنگ؟ یہ جنگی ارادے، ایک انسانی نہیں، شیطانی کھیل ہیں۔ ابلیسی تمنائیں ہیں۔ شیطان جنگ کے میدان میں اپنا دف بجا کر کھیلتا ہے۔ بچوں کی لاشوں پر، نوجوانوں کے روندے ہوئے جسموں پر اور بوڑھوں کے چیتھڑے ہوئے چہروں کو دیکھ کر ابلیس خون کے اس دریا میں رقص کرتا ہے۔ تالیاں بجاتا ہے اور قہقہے لگاتا ہے۔ یہی انسان ہی تو تھا جس کے لئے اسے جنت سے نکالا گیا۔؟ اور اب یہی انسان دنیا کو جہنم بنا رہا تھا۔

شینؔ مظفرپوری

محمد ولی الرحمٰن شیدا مظفرپوری (مگر یہ نام متروک ہے) اب شینؔ مظفرپوری، ابن حافظ محمد عین الحق مرحوم، ۱۹۲۰ء کو اپنے وطن مالوف اصلی ضلع سیتامڑھی (پہلے ضلع مظفرپور تھا) میں پیدا ہوئے۔ ان دنوں آپ کی سکونت شہر عظیم آباد ہے۔

آپ نے اردو اور فارسی کی تعلیم مدرسہ سے حاصل کی اور اس کے بعد کلکتہ یونیورسٹی سے آئی۔ اے کیا۔ ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۷ء سے ہوتا ہے۔ اصناف نثر میں افسانوں کے علاوہ ناولٹ، ناول، انشائیے اور مزاحیہ مضامین اور ڈرامے لکھے ہیں جن میں اکثر و بیشتر تخلیقات ہندوستان کے تمام معیاری رسالوں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس کے علاوہ ریڈیو سے بھی آپ کے افسانے اور ڈرامے نشر ہو چکے ہیں۔ آوارہ گرد کے خطوط، کڑوے گھونٹ، دکھتی رگیں، حلالہ، دوسری بدنامی، لڑکی جوان ہو گئی (سبھی افسانوی مجموعے)، تین لڑکیاں ایک کہانی (ناولٹ)، چاند کا داغ (ناول)، ہزار راتیں، کھوٹا سکہ (ناول) اور آدھی مسکراہٹ (طنز و مزاح) آپ کی مطبوعہ تصنیفات ہیں۔ ادبی خدمات کے تحت راشٹر بھاشا پریشد اور اتر پردیش اردو اکاڈمی سے بھی انعام پا چکے ہیں۔ فنی طور پر آپ کے پسندیدہ شعراء اور ادباء بالترتیب ہیں: اقبالؔ، غالبؔ، جوشؔ، فیضؔ، ساحرؔ، منٹوؔ، کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدیؔ۔ آج کل آپ بہار اردو اکاڈمی پٹنہ کے رسالہ "زبان و ادب" کے مدیر ہیں۔ نمونۂ تخلیق میں آپ کے

(۲۴) سید محمد نظیر حسین، تخلص شائق عظیم آبادی تیسری صفر ۱۲۷۸ھ میں پیدا ہوئے۔ قریبی قرابت سے شاد عظیم آبادی کے بھانجے تھے۔ اور شاد کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھے۔ مضمون آفرینی، محاوروں کی بندش، سلاست، زبان اور طرز بیان آپ کا خاص حصہ تھا۔

گلہ کرتے ہو شائق شکر کے سجدے نہیں کرتے
برا کیا ہے کسی کوچہ میں جا کر دل کا رہ جانا

(۲۵) نذر الرحمٰن، تخلص حفیظ خلف سید تجمل حسین ۱۲۷۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۳۳ھ میں بعارضہ استسقاء اس دار فانی سے رحلت کی۔ شاعری میں عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں کافی دستگاہ حاصل تھی۔ آپ صاحب دیوان (نظم الغریب) تھے۔

جاتے ہیں اے حفیظ ہم یاں سے اب سوئے عدم
دیکھیں گے روضۂ ارم یاں کی بہار دیکھ کر

(۲۶) نصیر الدین حسین تخلص نصیر ۱۲۷۹ھ میں شہر عظیم آباد کے محلہ مغلپورہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تصنیفات "ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم" اور "مثنوی حقیقت علمی شاعری ہے"

جب یگانوں ہی سے خاطر شکنی ہوتی ہے
تو وطن ہی میں غریب الوطنی ہوتی ہے

(۲۷) محمد مرزا افق عظیم آبادی، تلمیذ شاد۔ موصوف نے مرثیہ، سلام اور نغمہ خوب کہے اور غزلیں بھی خوب کہتے تھے۔ بارود میں آگ لگ جانے کی بناء پر بائیس برس کی عمر میں رحلت کر گئے۔ سال وفات شاید ۱۳۲۱ھ ہے۔

دل اسکا پہنچ کہ شانہ بھی ہے عاجز
دل زلف گرہ گیر سے کس طرح رہا ہو

ایک افسانہ بعنوان "کسی سے کہنا نہیں" کے چند اقتباسات منسلک ہیں:۔

سفید پوش عورت کے بچے کا ہاتھ میلی عورت کی دودھ سے کٹھلائی ننگی چھاتی پر جا پہونچا ہے۔ بچہ چھاتی کے ابھار کو ٹٹول کر اس کی نپل کو دو انگلیوں کے مساس سے محسوس کرتا ہے پھر آنکھیں بند کئے کئے ہی بیک وقت اپنا منھ بھی بڑھاتا ہے اور چھاتی کو دبوچ کر اپنے منھ کے قریب بھی کھینچتا ہے۔ کہتے ہیں کہ گود بھری عورت سو رہی ہو تب بھی اس کی ممتا جاگتی رہتی ہے۔ ممتا کی تو کوئی ذات یا پوشاک ہوتی نہیں ہے۔ تبھی یہ میلی عورت بھی نیند کی بے خبری میں خود بخود چت سے کروٹ ہو جاتی ہے۔ اپنی چھاتی کی گھنڈی بچے کے منھ میں ٹھونس دیتی ہے۔ اور بچے کو کلیجے سے لگا کر پھر نیند میں ڈوب جاتی ہے۔ بچہ چسر چسر اپنا شغل شروع کر دیتا ہے ــــ

اس وقت فطرت کے اس شاہکار منظر پر کسی کا دھیان نہیں ہے۔ ایسا واقعہ تو صدیوں میں کہیں ایک آدھ بار ہی ظہور میں آتا ہوگا مگر اس کی قدر و قیمت کو محسوس کرنے والا یہاں پر نہ کوئی شاعر ہے، نہ کوئی افسانہ نگار نہ مصور۔ اس کی بھرپور چھاتی کے نظارے سے ان کی نگاہیں پہلے ہی سیر ہو چکی ہیں۔ اب کوئی منھ دھو رہا ہے، کوئی لیوٹری کی طرف ہے، کوئی چلّو پانی میں مشغول ہے۔ اف، جو دیکھنے کا اصل منظر ہے، اس پر نگاہ پڑی بھی تو کس کی؟ ــــ سفید پوش عورت کے شوہر کی۔

اے بدبخت عورت دیکھ کہ برہمن کا بچہ دُساد ھن کی چھاتی سے دودھ پی رہا ہے! اور تب بدحواس سفید پوش عورت جھپک کر اپنے بچے کو کھینچ لیتی ہے۔ گھبرا کر آس پاس نظر اٹھاتی ہے کہ کسی نے دیکھ تو نہیں پایا۔ ہاں اب

کئی نگاہوں نے اس الہامی منظر کو دیکھ لیا ہے اور ماجرا بھی کچھ کچھ پلّے پڑ رہا ہے۔ سفید پوش میاں بیوی کے دل و دماغ کی مشین اسٹیم کے انجن سے بھی زیادہ متحرک ہو رہی ہے ـــــ ہائے، اس کا پرائشچت کیسے ہوگا؟

سفید پوش عورت ابھی اسی حادثے کے غم میں گھل رہی ہے۔ میلی عورت کے کان کے پاس منھ لے جاکر کچھ کہتے ہوئے دس روپئے کا ایک مڑا ہوا نوٹ اس کی چھاتیوں کے درمیان بلاؤز کے اندر سرکا دیتی ہے۔ میلی عورت کو ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ نوٹ کو باہر نکالنا چاہتی ہے تو سفید پوش عورت اس کا ہاتھ تھام کر گڑگڑانے لگتی ہے۔ میلی عورت مزاحمت روک کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی ہے اور مان جاتی ہے۔ مگر پوٹلی اور بچے کو سنبھالتی ہوئی وہاں سے چل دیتی ہے۔ ابھی ابھی ذرا دیر پہلے جو واردات گذر چکی ہے اس سے سفید پوش برہمن عورت کی طبیعت گھنا چکی ہے۔ اگر بس ہوتا تو وہ اپنے بچے کو تے کرا دیتی ـــ

احمد یوسف

احمد یوسف ابن سید محمد یوسف، سکونت محلہ صدر گلی، عظیم آباد پٹنہ

آپ شہر عظیم آباد پٹنہ میں فروری ۱۹۳۱ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کی علمی لیاقت بی۔ ایس۔ سی ہے۔ باضابطہ طور پر آپ کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۸ء سے ہوا۔ ادبی تخلیقات میں افسانے، ریونا شر، مضامین اور فیچر ہیں۔ جو ہند و پاک کے اہم رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں اس کے علاوہ ریڈیو سے بھی

ان کے بہت سارے افسانے اور فیچر نشر ہو چکے ہیں۔ "روشنائی کی کشتیاں" اور "آگ کے ہمسائے" (افسانوی مجموعے) آپ کی مطبوعہ تصنیفات ہیں۔ منٹو، بیدی اور قرۃ العین حیدر آپ کے پسندیدہ افسانہ نویس ہیں بموزۂ تخلیق میں آپ کے ایک افسانہ بعنوان "عبدالرحیم ٹی اسٹال" کے چند اقتباسات یہ ہیں:۔

عبدالرحیم، مالک عبدالرحیم ٹی اسٹال آج مر گیا۔ ہم اسے منوں مٹی کے نیچے دبا کر قبرستان کی تنہائیوں میں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ گویا ایک داستان ختم ہو گئی۔ ایک تاریخ کھو گئی۔ لیکن ہمارے اور اس کے درمیان جو ایک رشتہ تھا، جو محبت تھی اس کی بھی تو ایک داستان ہے، اس کی بھی تو ایک تاریخ ہے، اور بھی تو کہیں دل کی تنہائیوں میں دبی پڑی ہے۔

اور گو یہ بات ہمیں ناگوار گذری کہ ہم جو آٹھویں، نویں، دسویں اور گیارہویں جماعت میں پڑھتے ہیں۔ ہمیں اتنا نادان سمجھا گیا کہ گویا ابھی تک ہمارے کھلونا کھیلنے کے دن ہیں۔ لیکن جب ہم نے ٹھنڈے دل سے اس پر غور کیا تو پتہ چلا کہ عبدالرحیم تو واقعی ہمارے لئے کھلونا ہے۔ یہ گوشت پوست کا کھلونا، ہنستا ہے، بولتا ہے اور روتا ہے۔ روتا اس لئے ہے کہ اس کے سینے میں ایک دل بھی ہے اور ہم میں سے ہر شخص نے یہ محسوس کیا کہ عبدالکریم کے یہی لیل و نہار رہے تو یہ ہنستا بولتا کھلونا ہمیشہ کے لئے بجھ کر رہ جائیگا۔

عبدالرحیم بڑا ہی کاروباری ثابت ہوا۔ ہم سوچتے عبدالرحیم اپنی خداداد صلاحیتوں کو روبہ کار لا رہا ہے۔ چار بجے صبح اس کی دوکان سے کوئلہ توڑنے کی آواز سنائی دیتی اور جب وہ کوئلہ چولھے میں ڈال کر آگ

روشن کر دیتا تو اسی سناٹے میں اس کی طبیعت بے قابو ہو جاتی اور یکایک بڑی زوردار قوالی شروع ہو جاتی۔

"محمد حشر کے میداں میں دولھا بن کے نکلیں گے"

ہم میں سے کوئی بول اٹھتا۔ "آگیا حرام خور قوال کی اولاد"۔ لیکن دوسرا اسے ڈانٹتے ہوئے کہتا۔ "اپنا دوست ہے۔ کیوں سویرے سویرے گالیاں دے رہے ہو"۔ اور وہ جواب دیتا" ہوگا دوست فی الحال تو دشمنی برت رہا ہے"۔ اور جب چائے تیار ہو جاتی تو عبدالرحیم دوکان ہی سے ہانک لگاتا۔ "بھیا چائے تیار ہے"۔ دراں حالیکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ہم نے زندگی میں کبھی بھی صبح کی پہلی کرن کا نیاز حاصل نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کے ہتھوڑے کی آواز اور اس کی گرج دار قوالی سے آدمی تو آدمی مردے بھی کفن سے باہر آنے پر مجبور ہو جاتے۔

اس واقعہ کو پورے دس سال گذر چکے ہیں۔ عبدالرحیم کو مرے آج دوسرا دن ہے۔ اور میں سوچ رہا ہوں کہ یہ "ٹی اسٹال" جسے عبدالرحیم نے اپنی محنتوں اور صلاحیتوں سے کھڑا کیا تھا۔ اب تو بند ہی ہو جائے گا۔ لیکن قُل کے دوسرے دن جب عبدالکریم آیا تو اس کے سر پر عبدالرحیم کی ٹوپی تھی اور ہاتھ میں گلاب چھاپ پتی کا ایک بنڈل۔ میں نے پوچھا "عبدالکریم اب کیا ارادے ہیں۔ اب تو تمھیں سنبھل جانا چاہیئے"۔ عبدالکریم نے بسورتے ہوئے کہا۔ "چھوٹے بھیا اب تو پورا ہوش آگیا"۔

شبّیر احمد

شبیر احمد ابن عبدالودود مرحوم، کی پیدائش پڑی (دربھنگہ) میں ۳۰ مارچ ۱۹۳۸ء کو ہوئی۔ علمی لیاقت ایم۔ اے ہے اور پی ایچ ڈی کے لئے اپنا مقالہ پروفیسر لطف الرحمن کی نگرانی میں مکمل کر کے بھاگلپور یونیورسٹی میں داخل کر دیا ہے۔ فی الحال پیشہ ورانہ مشغولیات کے تحت معلمی اور صحافت کے میدان سے گذر رہے ہیں۔

آپ کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۵۶ء سے نثر نگار کی صورت میں ہوا اپنی نثر نگاری میں انھوں نے افسانے مضامین اور تبصرے لکھے ہیں۔ جو سبب، اور اتن (کراچی)، آہنگ (گیا)، اور بیسویں صدی (دہلی) وغیرہ رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ریڈیو سے بھی کئی افسانے نشر ہوئے ہیں۔ آپ کی مطبوعہ تصنیف "اعتراف" (افسانوی مجموعہ) ہے۔ ادبی خدمات کے عوض میں ہندی ساہتیہ اکاڈمی کی جانب سے دو ہزار کی رقم مل چکی ہے۔ ان دنوں پٹنہ میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہیں نمونۂ تخلیق میں آپ کے ایک افسانہ بعنوان "چور دروازہ" کے چند اقتباسات منسلک ہیں:۔

کمرے کے اندر ایک ادھیڑ عمر کی خاتون اس کی منتظر تھیں مسعود کی نظر جیسے ہی ان پر پڑی۔ اس نے بڑے ادب سے انھیں سلام کیا اور انھوں نے خوب خوب دعائیں دیں۔ اشارہ پاکر وہ پلنگ پر بیٹھ گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ اتنے میں اس ادھیڑ خاتون کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"بیٹا تم کو تعجب ہوگا کہ آخر جان نہ پہچان اور یہ میں نے تمھیں اتنی

بے تکلفی سے اندر کیوں بلا لیا۔" وہ بھلا کیا جواب دیتا۔ وہ خود بھی یہی سوچ رہا تھا۔ پھر خاتون ہی بولیں: "تم پڑوس میں رہتے ہو، کم از کم اس ناطے بھی ہمارا کچھ نہ کچھ حق تم پر ہے۔ اتنے قریب رہنے کی وجہ سے میں ساری باتیں تمہارے بارے میں جانتی ہوں۔ تم جیسے شریف بچے کہاں ملتے ہیں۔" مسعود اپنی تعریف سے خوش ہو گیا۔ اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا "یہ آپ کا خلوص اور محبت ہے آپ میری بزرگ ہیں۔ فرمائیے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

"خوش رہو بیٹا! مجھے تم سے یہی امید تھی۔ اسی لئے تمھیں بلوایا تھا۔"

"تو پھر حکم دیجئے! میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"اگر تم میری یہی مدد کر دو کہ کچھ ایسے لوگوں کو ٹھیک کر دو جن کا کھانا میں بنا دیا کروں۔"

"آپ ــــــ؟" اسے بڑا تعجب ہوا

"بیٹا! قسمت جو نہ کرائے۔ اب میں کہیں جا کر دائی گیری تو کر نہیں سکتی۔ گھر میں جوان بیٹی ہے اسے چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں۔ پھر خاندان کی شرافت کی پھٹی چادر گھر کی چہار دیواری سے باہر قدم نکالنے کے تصور ہی سے تار تار ہو جاتی ہے۔ اس لئے ایسے لوگ جو مجبوراً ہوٹلوں میں کھاتے ہیں مگر وہاں کھانا نہیں چاہتے۔ انھیں تم چاہو تو لا سکتے ہو۔ میں کم سے کم ماہانہ خرچ میں ان لوگوں کا کھانا بنا دیا کروں گی۔ اور اس طرح ہماری روٹی کا بھی سامان ہو جائے۔

وہ کبھی کبھی کھانا کھانے بڑی بی کے یہاں بھی چلا جایا کرتا مگر عام طور پر وہ اپنے کمرے میں ہی کھانا منگوا لیا کرتا تھا۔ ایک روز اس نے مسلم لاج کے ایک طالب علم سے ملاقات کی۔ تاکہ وہ وہاں کے تمام طلبہ

کو اس بات پر رضامند کرے کہ وہ سب بڑی بی کے یہاں ہی کھانا کھائیں۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ بات کہے۔ وہ طالب علم بڑی تلخ ہنسی ہنسا اور بولا "کیوں جناب! خوب ڈھیٹ ہیں آپ بھی۔ بڑی بی کے یہاں جانے والے تو بس ایک چور دروازہ ہی جانتے ہیں۔ آپ نے تو تمام پابندیوں کو بالائے طاق رکھ کر صدر دروازے ہی کو اپنی راہ گذر بنایا ہے۔

رحیم خاں نے پوچھا اس کا اشارہ مسعود کی طرف تھا۔ "نیا شکار ہے ابھی تو دام میں پھنسا رہی ہوں۔ بہت جلد پھنس جائے گا۔ تب وہ بھی چور دروازہ سے آیا کرے گا۔"

رحیم خاں مسکراتے ہوئے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے فوراً بعد ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس نے آتے ہی بڑی بی کو نہایت ادب سے جھک کر سلام کیا۔ اور وہ اسے خوب خوب دعائیں دینے لگیں۔ جیسا کہ مسعود کو دیا کرتی تھیں۔

"رضیہ کہاں ہے بی بی جی۔"

"اوپر"

"کوئی اور بھی ہے۔"

"نہیں وہ تنہا ہے تمہارا ہی انتظار کر رہی ہے۔ رحیم خاں سے اسے معلوم ہو چکا ہے کہ تم آئے ہو تمہارے آنے کی خبر سنتے ہی وہ خوشی سے چہکتے ہوئے اوپر بھاگ گئی۔"

شفیع مشہدی

سید شفیع الزماں مشہدی اصلی نام، شفیع مشہدی ادبی نام

ابن سید امیر الدین مرحوم کی پیدائش گیا میں پہلی اپریل ۱۹۳۹ء کو ہوئی آج کل بہار سول سروس (ایگزیکیوٹیو برانچ) کے آفیسر عہدہ پر فائز ہیں۔

موصوف کی ادبی زندگی کا آغاز باقاعدہ ۱۹۶۱ء سے ہوا لیکن اس سے قبل کالج کے زمانے میں بھی لکھا کرتے تھے۔ یوں تو آپ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں لیکن شعر و شاعری سے بھی لگاؤ ہے۔ چنانچہ اصناف سخن میں غزل، نظم اور قطعہ پر بھی ذوق آزمائی کی ہے۔ آپ کی اکثر و بیشتر تخلیقات بیسویں صدی، آجکل، شب خون، صبح نو، معیار، زبان و ادب، سہیل، کتاب اور دیگر رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ریڈیو سے بھی کہانیاں، ڈرامے، مضامین اور غزلیں نشر ہوتی رہتی ہیں۔ آپ کی تصنیف "شاخ لہو" (افسانوی مجموعہ) منظر عام پر آچکی ہے۔ اس کے علاوہ ڈراموں کا مجموعہ "انگلیاں نگار اپنی" اور شعری مجموعہ زیر ترتیب اور طباعت کے مرحلے میں ہیں۔ فنی طور پر آپ کے پسندیدہ ادبا اور شعرا کی فہرست میں قرۃ العین حیدر، منٹو، فیض وغیرہ ہیں۔ آج کل آفیسر کالونی (پٹنہ) میں سکونت پذیر ہیں۔ نمونۂ تخلیق میں آپ کے ایک افسانہ بعنوان "طوطے کا انتظار" کے چند اقتباسات منسلک ہیں:۔

عزیز ماموں کی گرفت ہینڈل پر اور سخت ہو گئی تھی۔ اور آنکھوں میں ایک عجیب سا درد جھلک آیا۔ سید شاہ امین احمد صاحب کے صاحبزادے عزیز امام کو اس حالت میں دیکھ کر وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پایا۔ وہ حیرت سے دیکھتا رہا۔ عزیز ماموں نے خاموشی توڑی "کیسے ہیں چھوٹے بابو۔ بہت دن پر گھر یاد آیا۔ بیٹھ جائیے میں لے چلتا ہوں۔" وہ مشین کی طرح رکشے پر بیٹھ گیا تھا اور عزیز ماموں رکشا چلانے لگے۔ عزیز ماموں کی دھنسی ہوئی آنکھیں، پچکے ہوئے گال اور بوسیدہ کپڑے پوری کہانی کہہ رہے

تھے۔ کمزور جسم سے رکشا کھینچتے ہوئے عزیز ماموں ایسے لگ رہے تھے جیسے خود اپنی زندگی کی لاش کو کھینچتے ہوئے قبرستان کی طرف لے جا رہے ہوں۔ وہ دم بخود سوچتا رہا۔

"کیا کرتا۔ خاندان کے لڑکے بھلا مجھ کنگال کی بیٹی سے کیوں شادی کرتے۔ کسی کو اسکوٹر چاہیئے تھا۔ کوئی پانچ ہزار نقد کا طالب تھا۔ میرے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ جوان بیٹی کو کب تک بٹھائے رکھتا۔ وہ تو بھلا ہو اکلو میاں کا کہ سید کے ماتھے کا کلنک تو دھو دیا انھوں نے۔"

اس کی آنکھوں کے سامنے بیس سال پہلے کے عزیز ماموں کی شبیہہ ابھر آئی۔ جب وہ گھوڑے پر سوار کندھے پر بندوق لٹکائے شکار کے لئے جا رہے ہوتے اور وہ یاسمین کے ساتھ دوڑتا ہوا ان کے گھوڑے کا تعاقب کرنے کی ناکام کوشش کرتا۔ عزیز ماموں بے پناہ شفقت سے پیچھے مڑ کر آواز دیتے۔

"بیٹے گھر جاؤ۔ آج تمھارے لئے طوطے لے کر آؤں گا۔" اور اسے یقین ہو جاتا کہ آج عزیز ماموں ضرور اس کے لئے طوطے لے کر آئیں گے پھر جمن چچا پکڑ کر اسے حویلی کی طرف لے جاتے۔

"چھوٹے بابو گھر چلیئے۔ بڑی بیگم بلا رہی ہیں۔"

وہ سبز طوطے کی راہ دیکھتے دیکھتے سو جاتا اور ساری رات اس کے خواب میں رنگ برنگ کے طوطے اڑتے رہتے۔ دوسری صبح جب

وہ عزیز ماموں کے گھر جا دھمکتا اور ان سے شکایت کرتا تو وہ ہنسنے لگتے یا تمین بھی کھلکھلا کر ہنس دیتی۔ "بیٹے میں تمہارے لئے طوطا لایا تھا مگر اس فضلو کے بچے نے اڑا دیئے"۔ اور پھر وہ نوکر کو آواز دیتے۔ "ارے او فضلو کے بچے، چھوٹے میاں کو مٹھائی تو لا کر دے"۔ فضلو ڈھیر ساری مٹھائیاں لا کر سامنے رکھ دیتا۔ اور تھوڑی دیر کے لئے وہ طوطوں کو بھول جاتا۔

عزیز ماموں رکشے کے پاس کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اور چہرے پر کئی رنگ ابھر ابھر کر ڈوب رہے تھے۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ابھی ابھی عزیز ماموں فضلو کو پکار کر اس کے لئے مٹھائی لانے کا حکم دیں گے۔ مگر عزیز ماموں کے کانپتے ہاتھوں نے دفعتاً اس کے ہاتھ سے جھٹک کر نوٹ لے لیا۔ اور رکشا لے کر گلی کی تاریکیوں میں گم ہو گئے ——— اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس بار فضلو کے نہیں بلکہ خود اس کے ہاتھوں سے طوطے اڑ گئے ہوں۔

ذکیہ مشہدی

ذکیہ سلطانہ نام، اور ذکیہ مشہدی ادبی نام، بنت حکیم خلیق احمد کی پیدائش یکم ستمبر ۱۹۴۶ء کو ہوئی۔ پہلے لا ریٹو کنونٹ گرلس کالج میں نفسیات کی لکچرر تھیں۔ لیکن اب بیگم مشہدی (افسانہ نگار شفیع مشہدی کی شریک حیات) ہونے کی وجہ سے گھریلو کاموں میں معروف رہتی ہیں۔ صنف افسانہ نگاری میں رضیہ سجاد ظہیر کی شاگرد ہیں باضابطہ

(۳۸) سید علی احمد، تخلص بخبر عظیم آبادی۔ آپ کے متعلق غضنفر نواب دانش صاحب بتاتے ہیں کہ "ممکن ہے یہ ڈاکٹر علی احمد صاحب ہوں۔ اندازہ ہے کہ ان کی ولادت غدر ۱۸۵۷ء کے کچھ بعد ہوئی تھی۔ اور انتقال ۱۹۳۶-۳۷ء کے لگ بھگ ہوا۔"

حضرت شاد سے تلمذ ہے۔

ے یہاں تو میرا دل بھی میرے بس میں ہو نہیں سکتا
انھیں آسان ہے قابو میں کر لینا ہر اک دل کو

(۳۹) محمد فرید الحسن، تخلص فرد ابن اصغر شیخ سبحان علی مرحوم۔ یہ مولانا شوق نیموی کے چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۲۸۱ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ایک تصنیف مثنوی "برگ الفت" ہے، جو دوبارہ شائع ہوئی تھی۔

ے لاکھ پردہ کیا محبت کو مگر اے فرد ہم چھپا نہ سکے

(۴۰) بابو جگناتھ پرساد عاشق عرف ببو خلف منشی رادھا کشن قنوم کھتری ساکن محلہ چھوٹی پٹن دیبی میں ۱۸۳۱ء کو پیدا ہوئے۔ اردو کے علاوہ تھوڑی فارسی بھی جانتے تھے۔ خلیق اور منکسر مزاج تھے۔ بائیس سال کی عمر میں شاد کے شاگرد ہوئے۔ ۱۸۹۴ء میں بعارضۂ سل انتقال کیا۔ ایک دیوان موسوم "کارنامۂ عاشق" ۱۸۹۵ء میں طبع ہوا تھا۔

ے رہا نہ ہوش ترے عشق میں بجا اپنا
بتوں کو سجدہ کیا جان کر خدا اپنا

(۴۱) شمس العلماء مولوی محمد یوسف رنجور عظیم آبادی ابن یحیٰی علی (صادق پور، عظیم آباد) ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی سو [۱۰۰] اردو رباعیوں کا مطبوعہ مجموعہ "گل صد برگ" ہے۔ معیاری پرچوں میں آپ کے مضامین اور غزلیں فخریہ چھاپی جاتی تھیں۔

طور پر آپ کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۷۲ء سے ہوا۔ اصناف نثر نگاری میں افسانے کے علاوہ مضامین بھی لکھتی ہیں۔ آپ کی نگارشات آجکل، زبان و ادب، شمع، بانو، سریتا اور دیگر رسائل میں شائع ہونے کے علاوہ ریڈیو سے بھی نشر ہوتے رہتے ہیں۔ فنی طور پر آپ کے پسندیدہ شعراء و ادبا بالترتیب شاد، فیض، قرۃ العین حیدر اور عصمت چغتائی ہیں۔ فی الحال اپنے شوہر کے ہمراہ آفیسرس کالونی پٹنہ میں سکونت پذیر ہیں۔ نمونۂ تخلیق میں آپ کے افسانہ بعنوان "ایک تھکی ہوئی عورت" کے چند اقتباسات منسلک ہیں:۔

وسندھرا کا مطلب ہے دھرتی۔ اکثر اس کے کانوں میں سنجیدہ بوڑھے سفید پوش برہمن ماسٹر صاحب کی آواز گونج جاتی۔ جب وہ کوئی دس برس کی تھی تو اس کی دوست مدھو نے بتایا تھا کہ اس کے نام کا مطلب ہے شہد۔ تب ہی اس کو بھی سوجھا کہ ماسٹر صاحب سے اپنے نام کے معنی پوچھے۔ لیکن معنی سن کر کچھ اداس سی ہو گئی۔ دھرتی تو بہت دکھ جھیلتی ہے۔ نہ جانے کتنی بار اس کی چھاتی پھٹتی ہے۔ نہ جانے کتنے قدم اس کو روندتے ہیں اور اس کے یہ کہنے پر پاپا بولتے تھے بھئی بڑی Phenomenon لڑکی ہے۔ یہ لڑکی کچھ شاعر وائر بنے گی۔ وسندھرا شاعر تو نہیں بنی لیکن اس کے مزاج میں جو اداسی تھی وہ ہمیشہ یوں ہی رہی۔

"تو سمجھتی ہے وسو کہ محبت صرف لٹریچر والے کر سکتے ہیں۔ کیا بابو کیمسٹری والوں کے دل نہیں ہوتا۔" اور اس نے اپنا ہاتھ وسندھرا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس وقت کسی مضبوط درخت کے تناور تنے جیسے اس ہاتھ میں لرزش تھی۔ اور وسندھرا کا پورا وجود کسی نازک بیل کی طرح ہوا

کے ساتھ کبھی دائیں جھول رہا تھا اور کبھی بائیں۔ اس وقت بہت خوفزدہ ہو کر اس نے سوچا کہ یہ لمحہ بیت جائے گا۔ وہ اس 'آج' کو اس 'ابھی' کو ذہن میں محفوظ کرے ورنہ کل ــــ یا کل کیوں بس چند مزید لمحوں بعد یہ لمحہ گذر چکا ہوگا۔ ٹھہر جا اے وقت ٹھہر جا۔ اور اس نے کانپ کر آنکھیں بند کر لیں۔

نہ جانے کیوں سال پورا ہوتے ہوتے ہی وسندھرا کو محسوس ہونے لگا تھا کہ آجے کی چاہت کا رنگ پھیکا پڑنے لگا ہے۔ وہ پہلے بھی بہت سنجیدہ تھا۔ جذباتی کبھی نہیں تھا لیکن ایسا بھی کیا۔ وسندھرا کو لگتا جیسے شاخ پر پھول تو موجود ہو لیکن دھوپ سے اس کا رنگ اڑنے لگا ہو اور خوشبو بکھر چکی ہو۔ پھیکا پھیکا سا بے رنگ و بو پھول۔ اسے اجے سے واحد شکایت یہی تھی کہ اس کے پیار میں گرم جوشی نہیں رہی۔

وسندھرا کو شدید جھنجھلاہٹ ہوتی۔ مگر آنسو پیتی وہ اجے کی پشت سے چمٹ کر سونے کی کوشش کرتی ہے۔ شادی کے بعد سے ایسا ہی ہوتا چلا آرہا ہے کہ جب تک وہ اجے کے گرد اپنے بازو نہ ڈال لے اسے نیند نہیں آتی۔ مگر کیسا پتھر ہے یہ شخص۔ اسے چھوئے بغیر سو جاتا ہے۔ یہ بھی نہیں کہتا کہ "وسندھرا تو کب آرہی ہے ادھر ــــ مجھے تو نیند آچلی بس اب جلدی آجا۔" ایسا ہو تو ساری شکایت دور نہ ہو جائے۔ دل کیسا پگھل اٹھے۔

بھاری دل کے ساتھ وہ ایک بار پھر اپنی سہاگ رات کو یاد کرتی

ہے۔ ہاتھ بڑھا کر ان لمحوں کو پکڑ لینا چاہتی ہے جو پانچ سال پہلے ایک مرتبہ اس کی زندگی میں آئے تھے۔ مگر وہ تو چمکیلی مچھلیوں کی طرح آنکھوں کے آگے ناچتے ہیں۔ اور غڑاپ سے وقت کے دھارے میں بہتے ہوئے دور چلے جاتے ہیں۔ آنسو پیتے ہوئے وہ کروٹ بدلتی ہے اور اجے کی پشت سے چمٹ کر سو جاتی ہے۔

رضوان احمد

رضوان احمد خاں اصلی نام، رضوان احمد قلمی نام ابن غبار بھٹی اپنے والد کے ہمراہ پٹنہ آئے اور یہیں کے ہو گئے آپ کی پیدائش ۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو ہوئی۔ علمی لیاقت بی۔ اے آنرس اردو اور ایم۔ اے (پٹنہ یونیورسٹی) ہے۔

یوں تو آپ کو ادبی ماحول بچپن سے ہی ملا۔ کیوں کہ آپ کے والد بزرگوار خود ہی ایک اچھے شاعر ہیں۔ جس کا اثر لازم تھا۔ ادبی دنیا میں آپ بحیثیت نثر نگار پہچانے جاتے ہیں۔ آپ رسالہ 'زیور' پٹنہ کے مدیر رہ چکے ہیں اور ان دنوں روزنامہ عظیم آباد ایکسپریس پٹنہ کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ آپ کے تقریباً پچاسوں افسانے اور مضامین ہندوستان کے اہم رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے ماسوا افسانے، مضامین اور ڈرامے ہندوستان کے مختلف اسٹیشنوں سے نشر بھی ہو چکے ہیں۔ آپ کی مطبوعہ تصنیفات: یونان کی شہزادی (بچوں کے لئے: ۱۹۶۸) مسدود راہوں کے مسافر (افسانوی مجموعہ۔ ۱۹۷۹) اور ایک آسامی "ناول" بادل پھٹ گئے"

کا ترجمہ (۱۹۷۹) ہیں۔ جس میں مسدود راہوں کے مسافر اور آسامی ناول کے ترجمہ پر یوپی اردو اکاڈمی کی جانب سے انعام بھی پا چکے ہیں۔ بطور نمونہ تخلیق میں آپ کے ایک افسانہ بعنوان "فصیلِ شب" کے چند اقتباسات منسلک ہیں :۔

ایسے وقت میں ایک مکروہ چہرے والا شخص لمبے لمبے ڈگ بھرتا سڑک پر نظر آتا۔ اس کی ٹانگیں بانس کے ٹھوں کی طرح لمبی تھیں اور اس کا قد کئی منزلہ بلڈنگوں سے بھی نکلتا تھا۔ وہ آتے ہی پہلی بلڈنگ کے جھروکے سے آنکھیں لگا کر کچھ دیکھتا تھا۔ اور پھر جھک کر رجسٹر پر لکھتا جاتا تھا پھر اس عمل کو دہراتا ہوا آگے بڑھ جاتا تھا۔ روزانہ شام کو آنا اور یہ عمل دہرانا اس کا معمول بن گیا تھا۔ اس معمول میں کبھی فرق نہیں پڑتا تھا۔ لیکن یہ عمل بستی والوں کے لئے بے حد تکلیف دہ تھا۔ کیوں کہ شام ہوتے ہی انھیں دبک کر اپنے گھروں میں بیٹھ جانا پڑتا تھا۔ بہتوں کو تو شاید اس بات کا علم بھی نہیں تھا کہ جب وہ گھروں میں بیٹھ جاتے ہیں تو اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ کیونکہ وہ گھروں کی کھڑکیاں اور روشندان بھی بند کر لیتے تھے۔ پھر کسی کو باہر کی دنیا کا خیال بھی نہیں آتا تھا کہ ان کے کمرے سے الگ کون سی دنیا آباد ہے۔ بہتیرے تو اب ان حالات کے عادی ہو چکے تھے۔ کتنے تو شام کے بعد کی دنیا سے واقف ہی نہیں تھے۔

میں نے تو اسے ایک دن یوں دیکھ لیا تھا کہ وہ اس وقت جس عمارت کے ایک فلیٹ کے شگاف سے اندر جھانک کر جائزہ لے رہا تھا۔ میں اس کی بالائی منزل پر موجود تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں کی زد سے بچ کر نکل جانا کچھ ایسا آسان کام بھی نہ تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو کڑک دار آواز میں کہا ___ تم

یہاں کیا کر رہے ہو؟ میرا حلق خشک ہو گیا ــــ کیا تم نے وہ اعلان نہیں سنا جس میں کہا گیا ہے کہ سرِ شام جس نے اپنی مکین گاہ سے باہر قدم نکالا اس کو اپنی حرکت کی سزا بھگتنی ہوگی ــــ لیکن میری تو کوئی مکین گاہ نہیں ہے۔ میں نے بمشکل گھگھیا کر کہا ــــ کیا اس روئے زمین پر تمہارے پاس کوئی مکان نہیں ہے؟ میں تنہا نہیں ہوں۔ بہتیرے ایسے ہیں جن کے پاس کوئی مکان نہیں ہے جن کے سروں پر صرف آسمان کی چھت ہے اور جب وہ زمین پر قدم جمانے کی کوشش کرتے ہیں تو زمین ان کے قدموں تلے سے کھسک جاتی ہے۔

اس وسیع زمین پر جب پیدا کرنے والے نے ہی مجھے کوئی حصہ نہیں دیا تھا تو آخر میں کہاں جاتا اس لئے میری آوارہ گردی پر اسے بھی کوئی حیرت نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ وہ میرے وجود سے بے پرواہ ہوتا جا رہا تھا۔ ایک روز جب وہ بستی کے دوسرے پر چمکیلے غبار کی آڑ میں اپنے وجود کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا تو میں نے اس کے ساتھ ایک اور سایہ دیکھا۔ سائے روز بروز بڑھتے جا رہے تھے اور تاریکیاں مزید گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ غبار شب کی چادر اور بھی دبیز ہوتی جا رہی تھی۔

اچانک ایک زور کا دھماکہ ہوا اور میں اسے چھوڑ کر دھماکہ کی سمت پلٹا تو پتہ چلا کہ وہاں بھی اس نے چمنی توڑ دی ہے اور اس گھر کی بیش قیمت شے لے کر فرار ہو گیا۔ وہ مکان ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا۔ حالاں کہ وہ مکان تو عرصہ ہوئے بوسیدہ ہو چکا تھا۔ اس کی بنیادیں اتنی خستہ ہو گئیں کہ اپنا بھی بوجھ سنبھالنے کے قابل نہ رہیں۔ وہ اندر ہی اندر بالکل کھوکھلا ہو چکا تھا۔ شاید انھیں بھی بے زمینی کا احساس ہوا ہو۔ اور انھوں نے محسوس کیا ہو کہ ان

کی اساس ایک نیر فطری عمل پر ہے۔

اس نے میری باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید اس کے پاس میری باتوں کا کوئی جواب تھا بھی نہیں۔ ہر طرف بس ایک سناٹا تھا۔ ہو کا عالم تھا۔ بستی ویران سی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ ابھی اپنا کام شروع کر دے گا اور اندھیروں کی چلمن ہٹا کر کچھ سائے اس کے ساتھ ہو جائیں گے۔ ظلمتوں کی فصیل ٹوٹنے سے قبل ہی وہ سائے آکر اسی ہما ہمی میں گم ہو جائیں گے۔

شمیم صادقہ

شمیم صادقہ ابن محمد ایوب صدیقی مرحوم، ۳ر جولائی ۱۹۴۸ء کو شہر عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئیں۔ علمی لیاقت ایم۔ اے ہے۔

آپکی ادبی زندگی کا آغاز تعلیم کے دوران ہوا، جب آٹھویں جماعت کی طالبہ تھیں۔ آپ نے اصنافِ نثر میں صرف افسانوں پر طبع آزمائی کی ہے جو زبان و ادب، شاعر، نیا دور، آہنگ، پاسبان، ہم زبان، عصری آگہی، شناخت، نیا ورق، کوہسار، تحریک اور طاؤس جیسے معیاری رسائل میں اکثر و بیشتر شائع ہوتے رہے ہیں۔ اور اس کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے بھی ان کے افسانے برابر نشر ہوتے رہتے ہیں۔ آپ کا پہلا افسانوی مجموعہ بنام "کرچیاں" شائع ہو چکا ہے۔ جس کے مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ انھیں افسانوں کو ایک نئے انداز سے سجانے اور سنوارنے کا آرٹ حاصل ہے۔ حال میں آپ کا دوسرا افسانوی مجموعہ "ادھورے چہرے"

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

شائع ہوگیا ہے۔

فنی طور پر آپ کے پسندیدہ شاعر غالب اور ادیبوں میں قرۃ العین حیدر ہیں۔ ان دنوں آپ گورنمنٹ ڈینس کالج گردنی باغ پٹنہ میں شعبۂ اردو میں لکچرر کے عہدہ پر فائز ہیں۔ نمونۂ تخلیق میں آپ کے ایک افسانہ "میں" کے چند اقتباسات یہ ہیں:۔

یہ جو خشک الجھے الجھے بالوں اور ریت ریت سی آنکھوں والی لڑکی، ٹیبل کے دوسرے کنارے پر کھڑی ہے، اچانک میرے اندر کے سوئے ہوئے طوفان کو کتنی خاموشی سے جگا گئی ہے ـــــ شاید اسے اس کا احساس بھی نہیں ہے۔ اور نہ یہ احساس اسے ہوگا ـــــ کیوں کہ اس کی آنکھیں ان آہٹوں کی بازگشت ہیں، جو روح کے اوپر سے گذر چکی ہیں۔ اور اسی لئے اگر وہ شرما انکل کا سفارشی خط بھی لاتی تو میں اسے اپوائنٹ کر ہی لیتا۔ سچائی کے نشتروں سے احتراز ہر ایک کے بس کا نہیں ہوتا۔ اور جس کے بس میں ہو، وہ انسانی قدروں سے بہت دور ہوتا ہے۔

میں نے 'باسزم' جتا کے کبھی مردوں اور عورتوں کے درمیان رعایت کی حدیں بھی نہیں بنائی تھیں۔ پھر بھی یہ درخواست لئے گھنٹوں خلاء کو گھورتا رہ گیا۔ جیسے کسی زخم کا کوئی ٹانکا ٹوٹ گیا ہو۔ ان دیکھی گہرائیوں سے دور رس رہا تھا۔ اور میں سیما کے متعلق شعوری گریز کے باوجود، بس سوچتا رہ گیا تھا ـــــ جب کبھی کوئی شعوری سطح پر تحت الشعور سے ہار مان لے تو ہمدردی کا مستحق ہو جاتا ہے۔ یہ میں جانتا تھا۔ اور خود کو اپنی ہی ہمدردی کے تیروں سے بچانے کے لئے میرا شعور اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا ـــــ

مرد کبھی کسی کا تصوراتی گذر بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ جذبات وہیں یخ بستہ ہو جاتے ہیں۔ آئیڈیلزم کا مینار چور چور ہو جاتا ہے۔ جہاں نظروں میں تعریفی اعتراف کی ایک کرن بھی دکھائی دیتی ہے۔ مگر سیما کے متعلق میری ساری سوچیں سمت بدل لینے پر آمادہ تھیں۔ میں گھنٹوں سے منگوائی ہوئی چائے کے ساتھ اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں ایک اچھے میزبان کی طرح کرتا رہا، جیسے کہ ایک اچھے عیادت کرنے والے کی طرح اس کا دل بہلانا میرا فرض تھا۔

"سیما ــــ میرے ساتھ شادی کر لو ــــ تم بھی دل شکستہ ہو۔ میں بھی بہت آشفتہ حال ہوں۔ ہم مل کر خلوص اور پیار کی انوکھی روایت قائم کریں گے۔" تو وہ متحیر سی میری طرف دیکھنے لگی۔ مجھے بخوبی محسوس ہوا کہ جیسے سیما جان گئی تھی کہ میں عام مردوں کی طرح تنگ نظر، تنگ دل اور شکی نہیں، بلکہ فراخ دل اور وسیع النظر ہوں۔ جیسے احساسی، انسانی اور جذباتی قدروں کا پاس ہے۔ شاید اسی لئے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ بس خاموشی سے سر جھکائے اپنی چوڑیوں کو چھوتی رہی۔ اس نے صرف یہ کیا کہ جب لانے کو اٹھی، تو شاکر کی تصویر کو اٹھا کر الٹ کے رکھ دی۔

"یہ کیا؟" ــــ اس نے بڑے کربناک انداز سے گری ہوئی تصویر کو دیکھ کر کہا۔ میرے اور اس کے ہاتھ، ایک ساتھ اسے اٹھانے کو جھکے ــــ اچانک میرے جھکے ہوئے ہاتھ پر پانی کا ایک جلتا ہوا قطرہ اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑا ــــ اور ایک کرچی یوں چبھ گئی کہ خون کی لکیر سی بن گئی۔ اور مجھے محسوس ہوا، یہ لکیر نہ ہو، ایک ایسا بے کنار سمندر ہو جسکے

اس پار کھڑی سیما کو ایک نظر دیکھنے کی بھی خواہش نہ ہوئی ـــ میں نڈھال سا بستر کے ایک سرے پہ ٹک گیا ۔ اور سیما کی طرف ایسی نظروں سے دیکھنے لگا ۔ جیسے نظریں نہ ہوں، پتھروں کی بارش ہو، جس کا ایک وار اپنے احسان کی قیمت مانگ رہا ہو ـــ اور میں، اس طلب کے بعد میں کسی طمانیت سے لبریز تھا ۔ کہ میں نے میں کو پہچان لیا تھا ۔

عبید قمر

عبد الکریم اصلی نام، اور عبید قمر ادبی نام، ابن غلام احمد مجتبیٰ کی پیدائش ۴ر ستمبر ۱۹۴۶ء کو شہر پٹنہ کے محلہ گولک پور میں ہوئی ۔ آپ کی علمی لیاقت بی ۔ ایس ۔ سی ہے ۔

ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۶۸ء سے ہوا، جب آپ کا پہلا افسانہ بنام "فنکار" "نئی صدی لندن میں شائع ہوا تھا ۔ نثر نگاری میں صرف افسانے لکھتے ہیں ۔ اب تک انھوں نے جتنے بھی افسانے لکھے ہیں، وہ شاعر، نشانات، آواز، زبان و ادب اور الفاظ وغیرہ رسائل میں شائع ہوئے ہیں ۔ آپ کا ایک افسانوی مجموعہ بنام "آخری گشت" منظر عام پر آچکا ہے ۔ فنی طور پر آپ کے پسندیدہ ادباء منٹو، بیدی، کرشن چندر، سہیل عظیم آبادی، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور غیاث احمد گدی ہیں ۔ نمونہ تخلیق میں آپ کے ایک افسانہ بنام "ایڈونچر" کے چند اقتباسات منسلک ہیں :ـــ

"ہر سنڈے کا اپنا ریز رویشن ہے یہ ! میں تو تنہا ہوتا ہوں ۔ اور یہ جام و مینا ہی اپنا سب کچھ ہوتے ہیں ۔ ہاں نظریں، جذبات کے

(۸) حکیم غلام علی، تخلص مشتاق (محلہ گورہٹہ ۔ عظیم آباد)

ع جو ہر دکھا رہے ہو جو تیغ نگاہ کا
منظور چشم قتل ہے کس بیگناہ کا

(۹) میر محمد رضا خلف الرشید میر جمال الدین حسین جمال عظیم آبادی؛ جو میر ضیا کے شاگرد تھے۔

ع روتا پھرتا ہے نالے بھرتا ہے کہہ رضا ہیچ تو کس پہ مرتا ہے

(۱۰) مرزا ابراہیم شہر عظیم آباد کے قدیم مسلم الثبوت شعرا میں تھے۔

ع سامعاں کا نہ فقط سننے سے دم رکتا ہے
سرگذشت اپنی جو لکھیے تو قلم رکتا ہے

(۱۱) شیخ محمد روشن جوشش عظیم آبادی، جسونت رائے ناگر کی اولاد میں سے تھے۔ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اپنے وقت کے مسلم الثبوت استاد اور فن عروض کے ماہر تھے۔ بقول مؤلف "گلشن ہند" خوش لیاقتی ان کی جو کچھ کہتے اس سے زیادہ ہے۔

ع اوروں کی عیب جوئی اپنا ہنر نہیں ہے
اپنا ہی عیب جوئی ہے یہ ہنر ہمارا

تعلقات جہاں کی خبر نہیں رکھتا ہزار شکر کہ میں درد سر نہیں رکھتا

(۱۲) شیخ محمد عابد دل، شیخ محمد روشن جوشش کے بڑے بھائی تھے۔

ع دل میں ہمارے عشق کا جو درد ہے سو ہے
چہرے کا میرے رنگ وہی زرد ہے سو ہے

(۱۳) شاہ نور الحق تپاں۔ شاہ عبد الحقؒ کے صاحبزادے تھے جو سنہ ۱۱۵۴ھ میں پیدا ہوئے۔

ع عقل والوں سے جو سنتا ہے فسانہ تیرا بیٹھ پھیرے ہوئے ہنستا ہے دیوانہ تیرا

مختلف سمت سے ابھرتے رنگین غباروں کے خلا میں بے چینی کے محور پر رقص کناں ہوتی ہیں۔ اور پھر دیکھتے دیکھتے یہ ہنگامۂ ہاؤ ہو عجیب سی چیخ دپکار میں بدلنے لگتا ہے۔ جیسے تہذیب کی بیوہ کو ماتمی لباس پہنایا جارہا ہو۔ جھنکار کے ساتھ چوڑیاں توڑی جارہی ہوں۔ آہ و بکا کے ساتھ ماتھے کا سیندور پونچھا جارہا ہو اور ـــــ اور ایسے میں میری روح چیخ اٹھتی ہے۔ میں انجانے کرب سے سلگتا ہوں۔ اور تب بیئر کے یہ چند گھونٹ......"

"سچ ہے انسان اپنی فطری حیوانی جبلتوں سے کیوں کر چھٹکارا حاصل کرتا ہے۔ لیکن یہ تہذیب کے حصار سے نکل کر تو پھر حیوان ہی بن جاتا ہو! یہ غسل خانوں میں گنگنانا، عورتوں کے والہانہ گیت، مختلف اقسام کے ناچ، یہاں تک کہ صوفیوں کے حال قال میں بھی تو اسی جذبۂ حیوانی کی تسکین ہوتی ہے۔ پر یہ کیا کہ ہم صرف جذبوں کے محور پر رقص کرنے لگیں اور ساری بشریت کھوتے ہوئے ہپی ازم کی راہِ فرار میں گامزن ہو جائیں۔"

"حسن تو بد صورت و بے جان چیزوں میں بھی پنہاں ہوتا ہے۔ اس عالمِ رنگ و بو میں کون شے ہے۔ جس کی کوئی خوبی قابلِ تحسین نہ ہو۔ ہاں جمالیاتی حس اور بالغ نظری چیدہ چیدہ شخصیتوں کو ودیعت کی گئی ہے۔ لیکن ان کی قسمت میں تو محرومیاں ہی ہوتی ہیں۔ سب کچھ پا کر بھی احساس نارسائی کا زہر ان کے رگ و پے میں سرایت ہوتا ہے۔ پر کاتب تقدیر سے گلہ کون کرے۔ ایسے لوگ تو احساس کی صلیب پر ٹنگے ہوتے ہیں۔ اور ایام کی کانٹیاں لگتی جاتی ہیں۔"

"یو آر لکی ڈیر! میں اپنا کنوارہ جسم آج شام کی نذر کرتے ہوئے تمہارے حوالے کرتی ہوں۔ فیصلہ کر کے فلیٹ سے نکلی تھی کہ اس ہوٹل سے نکلتے ہوئے جس مرد پہ میری پہلی نظر پڑے گی، مردانہ لذت سے مجھے آشنا کرانے کا شرف بس اسے ہی حاصل ہوگا۔ آؤ ڈیئرسٹ پہلے تھوڑی سی گلابی چھلکائیں۔"

"نو تھینک یو! معاف کیجئے گا محترمہ میں رسم شادی کا قائل ہوں۔" یہ کہہ کر رشید بھائی نے نہایت اطمینان سے اس کی مَرمریں بانہیں اپنی گردن سے الگ کیں اور اسے 'گڈ بائی' کہتے ہوئے گیٹ سے نکل گئے۔

شوکت حیات

شوکت حیات۔ عمر تخمیناً ۴۳ سال، مسکن شہر پٹنہ ہے۔ ان دنوں بسکومان پٹنہ میں زیر ملازمت ہیں۔ نوجوان اور جدید افسانہ نگاروں کی فہرست میں آپ کا نام نمایاں طور پر ہے۔ آپ کے افسانے اکثر و بیشتر رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اور اس کے ماسوا ریڈیو سے بھی نشر ہوتے رہتے ہیں۔ نمونۂ تخلیق میں آپ کے ایک افسانہ بعنوان "سیلاب" کے چند اقتباسات یہ ہیں:۔

کچھ تنومند لوگ ہمدردی میں کود پڑے ہیں۔ تیزی سے تیرتے ہوئے بڑھ رہے ہیں اسی طرف جہاں ایک آدمی چھپر اور بغل میں کچھ دوری پر ایک تنومند بھینس بہے چلے جا رہے ہیں۔ لوگ تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ سب لوگ چھپر سے گذرتے ہوئے اس آدمی کے آگے بڑھ گئے ہیں۔ اور چاروں طرف سے بھینس کو گھیر چکے ہیں۔ سب کے چہروں پر کامیابی اور حصول

کی سرتیں ہیں۔ آہستہ آہستہ سب لوگ بھینس کو چھان کر کنارے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ آدمی پیچھے چھوٹ گیا ہے اور متوحش انداز میں "بچاؤ..... بچاؤ" چیختا ہوا یوں آنکھوں میں موت کو سمیٹے بہا چلا جا رہا ہے "بچاؤ..... بچاؤ ....." کی چیخ دور ہو گئی ہے۔

سطح آب پر آبی پودوں کے ایک جھنڈ میں ایک آدمی کی لاش پھنسی ہوئی بہہ رہی تھی۔ پانی کے کنارے بہت سارے بیٹھے، کھڑے اور سوئے اپنے اپنے علاقوں کے حشرسے خوفزدہ ہیں۔ ایک طرف بیٹھے ہوئے کچھ سیاہ فام لوگ سطح آب کا بہت دور دور تک عقابی آنکھ سے جائزہ لے رہے ہیں۔ پانی کی سطح سے لاوارث لاشوں کو نکال کر اسے اسپتال کے اپنا ٹومی ڈپارٹمنٹ میں فروخت کر دینا ان کے فاضل اوقات کا پیشہ تھا یہی ان کی زائد آمدنی کا ذریعہ ہے۔ ایک دو لاشیں کسی حد تک سلامت مل جائیں تو تھوڑی سی محنت سے رات بھر کی اچھی خاصی عیاشی کا انتظام ہو جاتا ہے۔ لاش پر نظر پڑتے ہی ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی ہے۔ وہ پانی میں کود پڑے ہیں۔

چھتوں پر بیٹھے ہوئے تمام لوگ اپنا بیش قیمت اثاثہ چھتوں پر منتقل کرنے کے بعد مطمئن تھے اور سیلاب کے مناظر خوف و دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ پھولتی ہوئی اس لاش کو دیکھ کر انھیں ابکائی آنے لگی۔ جس چھت کے پاس آ کر لاش ٹک گئی تھی اس پر سے کچھ لوگ ہاتھوں میں لکڑی لئے بیزار قدموں سے پانی میں اتر رہے ہیں۔ لکڑی کے زوردار جھٹکے سے لاش پرے ہٹ جاتی ہے۔ اطمینان کی سانس لئے ہوئے وہ اپنی چھت پر واپس آ گئے ہیں۔

اعجاز شاہین

اعجاز فاطمہ اصلی نام' اور اعجاز شاہین ادبی نام ہے محمد خلیل مرحوم' کی پیدائش شہر پٹنہ میں ہوئی۔ آزادی کے وقت آپ کی عمر تقریباً دو سال کی تھی۔ آپ کی علمی لیاقت ادیب کامل' ایم۔ اے' بی ایڈ ہے۔

ادبی زندگی کا آغاز نثر نگار کی صورت میں ۱۹۵۸ء سے ہوا۔ ادبی حیثیت سے مستقل طور پر آپ کے کوئی استاد تو نہیں ہوئے لیکن ۱۹۶۴ء سے صرف سہیل عظیم آبادی سے صلاح و مشورہ لیا۔ آپ کی تخلیقات میں افسانوں کے علاوہ چند ڈرامے بھی ہیں جو ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں۔ اور اس کے ماسوا کئی افسانے گلبن' بانو' صبح نو اور پاکستانی رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ آپ کی اکلوتی مطبوعہ تصنیف "تصور اور تصویر" (افسانوی مجموعہ) ہے۔ آپ کے پسندیدہ ادبا پریم چند' راجندر سنگھ بیدی' سہیل عظیم آبادی اور قرۃ العین حیدر ہیں۔

فی الحال آپ ایوب اردو گرلس ہائی اسکول پٹنہ میں پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہیں۔ نمونۂ تخلیق میں آپ کے ایک افسانہ بعنوان "سب سے بڑا گناہ سب سے بڑا ثواب" کے چند اقتباسات یہ ہیں:۔

اماں اپنے بڑے بیٹے کی کمزوری سے خوب واقف تھیں۔ مگر نہ معلوم کیوں اماں کو بہو بیاہ لانے کا شوق ہوا۔ اور ایک غریب کے دھوکے میں شہزادی کو بیاہ لائیں۔ دولت میں چاہے وہ کم ہو مگر حسن کے معاملے میں تو وہ بے حد غنی ہے۔ اور زیوروں سے اس غریب کو لاد دیا تاکہ بیوقوف اور بے ڈول شوہر کا شکوہ کرنے کی ہمت ہی نہ ہو۔ اماں نے اپنے جانتے تو عقلمندی کی مگر یہ فریب وہ صرف دنیا کو دے سکتی ہیں مگر وہ ..... احسان کی آنکھوں سے دو بوندیں ٹپک گئیں...

اور وہ چونک کر اٹھ بیٹھا ــــ آخر ہم تیرے کون ہوتے ہیں؟ یہ تیرا معاملہ نہیں..... یہ سوچ کر اس نے اپنا دل ہلکا کر لیا۔

اس نے نظر اٹھائی تو رعنا دلہن کی سیاہ سیاہ آنکھیں احتیاط سے مسکرائیں..... وہ بے قرار ہو کر اٹھ کھڑا ہوا..... بھابھی..... کیا آپ بھیا سے خوش ہیں؟..... اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ بس اتنا ہی تو وہ کہہ سکا تھا..... سفید سفید گال پر غم کے سائے لہرائے، سیاہ پلکیں جھک گئیں اور دو سرخ لب تھرتھرا کر چپک گئے ــــ چند لمحے وہ بہوت بن کر کھڑی رہی۔ یہ صرف سوال نہیں تھا، درد کی پہچان کا ایک راستہ تھا۔ ایک ہمدرد کو جو پایا تو رعنا دلہن کا غم خون کے ہر قطرے سے نکل کر آنکھوں میں جمع ہونے لگا۔ وہ بڑی تیزی سے یہ کہتے ہوئے مڑ گئیں "یہ سوال پوچھنے سے اب فائدہ؟"

احسان نے موقع پا کر ایک دن اماں سے بھی سوال کر ہی ڈالا ــــ "اماں، آپ نے یہ کیا ظلم کیا..... اتنی حسین لڑکی کو بیاہ کر لانے کی کیا ضرورت تھی، کیا آپ بھیا کو نہیں جانتی تھیں ــــ" وہ ایک دم بھڑک اٹھیں..... "اے لڑکے ــــ کیا دماغ چل گیا ہے۔ ایک غریب کو سونے سے لاد دیا..... اسے اب کیا چاہئے ــــ" "اماں" وہ خاموش نہیں ہوا۔ "زیور عورت کی کمزوری سہی، مگر کیا آپ کو صرف....." "ہاں..... ہاں" وہ گرجیں "اس نے کب اتنے لتنے بڑے بڑے کمرے دیکھے تھے ..... دو وقت کا کھانا تو نصیب تھا نہیں..... محلے والیاں تو اس کی قسمت پر عش عش کرتی ہیں" "اماں!" اس کی آواز برخلاف معمول تیز ہو گئی ــــ "دوسروں کی بات مت کیجئے۔ آپ صرف اپنی بتا دیجئے یہ رعنا کی غربت پر احسان ہے یا اس کے حسن پر ظلم"

اور آخر ایک روز بڑا زبردست ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ احسان رعنا سے بات کر رہا تھا اور اسے یہ سمجھا رہا تھا کہ ہمت سے کام لو...... جب تمھارا کوئی نہیں تو آپ اپنا سہارا بن جاؤ...... یوں گھٹ گھٹ کر تمھارا مرنا میں نہیں دیکھ سکتا جب تمھارے اوپر لوگوں نے ظلم کیا تو تم لوگوں کی کیوں پرواہ کرو...... سب جانتے تھے کہ بھیا کیا ہیں...... ؟ مگر...... اب تم قدم اٹھاؤ......" یہ ساری باتیں اماں نے سن لیں...... انھوں نے بڑا ہنگامہ کیا۔ احسان پر کم اور رعنا پر زیادہ الزام عائد کئے گئے ___ وارثی صاحب کو بھی خبر ہو گئی۔ سارا محلہ جان گیا۔ رعنا تو خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی، مگر احسان بالکل بے نیاز ہو کر سب لوگوں کی باتیں سن رہا تھا...... آخر رات کے وقت احسان کو بلوایا گیا۔ وارثی صاحب موجود تھے۔ انھوں نے پوچھا "میاں تم آخر کیا چاہتے ہو...... میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا ہوں" احسان ایک جھٹکے سے اٹھا "...... میں صرف رعنا بھابھی کی رہائی چاہتا ہوں ...... اور بس۔"

سب لوگ ایک دم خاموش ہو گئے...... وارثی صاحب نے احسان کا کا موڈ بگڑا ہوا دیکھ لیا تھا۔ "کیا اس کے بعد تم شادی کرو گے؟" احسان مسکرا دیا "ابا ___ بس اس کے آگے میں کچھ نہیں چاہتا ___

افتخار عظیم چاند

محمد افتخار عظیم چاند ابن محمد عبدالعظیم صاحب، کی پیدائش ۱۱ر فروری ۱۹۴۹ء کو شہر پٹنہ کے محلہ صادق پور میں ہوئی۔ آبائی مکان مسوڑھی ضلع پٹنہ ہے۔ تعلیمی لیاقت بی۔ ایس۔ سی (فائنل) تک ہے۔

ان دنوں روزنامہ عظیم آباد ایکسپریس پٹنہ کے آفس انچارج کے عہدہ پر فائز ہیں۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۶۳ء سے بچوں کی کہانی بنام "نیہ کیوں کا دیوتا" سے ہوا جو ماہنامہ مسرت پٹنہ کے شمارہ فروری ۱۹۷۱ء میں ہوا تھا۔ اس کے بعد نثر میں کئی افسانے اور مضامین کے علاوہ اصنافِ سخن میں چند غزلیں بھی کہی ہیں۔ اب تک انھوں نے بچوں کی تین کہانیاں، دس افسانے اور تقریباً بیس مضامین (جس میں مذہبی مضامین بھی شامل ہیں) لکھے ہیں۔ جو اکثر و بیشتر عظیم آباد ایکسپریس، پندار، مسائل، ایک قوم (ہفتہ وار جریدہ پٹنہ) اور آزاد (دہلی) میں شائع ہوئے ہیں۔ کچھ مضامین اور کہانیاں ریڈیو پٹنہ کی اردو سروس سے بھی نشر ہو چکی ہیں۔ غالب، اقبال، کرشن چندر اور راشد آپ کے پسندیدہ شعراء اور ادباء ہیں۔ نمونۂ تخلیق میں آپ کی کہانی بعنوان "آگ جو لگنے والی ہے" کے چند اقتباسات منسلک ہیں:۔

نعیم وہاں سے سیدھا گاندھی میدان جا پہنچا۔ پہلے تو اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا کہ کہیں وہ نوجوان اس کا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے۔ صاف بچ کر نکل آنے پر اس نے اطمینان کی سانس لی اور تنہا گوشے کی جانب لگی ہوئی ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی پاکٹ سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور کڑکڑاتے نوٹوں کو گننا شروع کیا۔ سو سو کے بیس عدد نوٹ تھے۔ پورے دو ہزار۔ آج اس کا ستارہ روشن تھا۔ بعد مدت کے اس نے لمبا ہاتھ مارا تھا۔ اور ہر روز کی کمائی مع سود کے آج پوری ہو گئی تھی۔ اب تو اس کے چند دن عیش کے ہوں گے۔ پھر وہ وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ لہٰذا وہ کھانے کی غرض سے ایک ہوٹل میں آ بیٹھا۔ کیوں نہ آج مرغ پلاؤ کھایا جائے؟ وہ بیٹھا سوچنے لگا۔۔۔۔ بہت دنوں سے وہ اچھا کھانا نہیں کھا پایا تھا۔ جب بھی ہوٹل میں آتا، لوگوں کو کھاتے پیتے ہوئے دیکھتا تو منہ میں پانی بھر کر رہ جاتا۔

لہٰذا آج اس نے بیرے کو مرغ پلاؤ، قورمہ اور میٹھے ٹکڑے کا آرڈر دیا اور کھانا لگ جانے پر خوب سیر ہو کر کھایا۔

بڑی مشکل سے، تگ و دو اور کافی جد و جہد کے بعد اس کی بہن کی منگنی ایک جگہ پکی ہو پائی تھی۔ لڑکا ٹیلر ماسٹر تھا۔ نقد جھوڑ سائیکل، ریڈیو، گھڑی اور سوٹ وغیرہ کی فرمائش تھی۔ اس سے قبل جتنے بھی لڑکے ملے سب روپیوں پر بکنے والے تھے۔ اشفاق کے پاس اتنی دولت نہ تھی کہ وہ روپیوں سے اپنی بہن کے واسطے لڑکے کو خرید سکتا۔ اس وجہ کر اس کی بہن کی شادی رکی ہوئی تھی۔ اور وہ گھر میں جوان بیٹھی تھی۔ اب شادی کی بات طے ہو جانے پر اشفاق کی پریشانیوں میں کچھ حد تک کمی آگئی تھی۔ اور وہ شادی کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا۔ لڑکے کی فرمائش وہ چند لوازمات خریدنے کے لئے آج شام کو بازار آیا تھا۔ اور گھڑیوں کی دوکان کی طرف جا رہا تھا کہ ایک موڑ مڑتے ہوئے وہ ایک پاکٹ مار سے ٹکرایا تھا۔ اور چند ثانیوں میں اس کی جیب کٹ گئی تھی۔ وہ بہت پریشان ہوا۔ اس کی ساری کمائی لٹ گئی تھی۔

اشفاق اپنے کمرے کی کھلی چوکی پر پڑا کروٹیں بدل رہا تھا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اسے شدت کی بھوک لگی تھی۔ لیکن وہ غموں کے حصار میں گھرا ہوا تڑپ رہا تھا۔ اس کے جسم کا رواں رواں رو رہا تھا..... اس کی جوان بہن کی شادی کیسے ہوگی؟ نکاح کس طرح ہوگا؟۔ اس کی ماں نے کئی دفعہ اسے کھانے کے لئے پوچھا تھا لیکن اس نے بھوک نہ ہونے کا بہانہ بنا دیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس پیٹ کی آگ کو بجھا سکتا ہے۔ لیکن اس آگ کو کیسے بجھا پائے گا، جو کل لگنے والی ہے۔

فخر الدین عارفی

فخر الدین عارفی ابن سید انہار الحسن کی پیدائش ۲۹ جنوری ۱۹۵۴ء کو شہر پٹنہ کے محلہ محمد پور شاہ گنج میں ہوئی۔

ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۶۶ء سے ہوا۔ نثر نگاری میں افسانے اور مقالات کے علاوہ چند منثور نظمیں بھی لکھی ہیں۔ آپ کی تخلیقات ہندوستان کے اکثر و بیشتر رسائل میں شائع ہوئی ہیں۔ اور اس کے ماسوا آل انڈیا ریڈیو پٹنہ کی اردو سروس سے بھی ان کی اکثر و بیشتر تخلیقات نشر ہوتی رہتی ہیں۔ ان دنوں ایک سرکاری اسکول میں مصروف درس و تدریس ہیں۔ غالب، منٹو، کرشن چندر وغیرہ آپ کے پسندیدہ ادبا و شعرا ہیں۔ ان کے نمونۂ تخلیق میں ایک افسانہ بعنوان "منظر بہ منظر" کے چند اقتباسات منسلک ہیں:۔

لیکن یہ میری خام خیالی ثابت ہوئی۔ حقیقت اس کے بالکل برخلاف تھی سورج یہاں بھی میرا تعاقب کر رہا تھا۔ اور اس کی تہر آلود نگاہوں نے ہنوز میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا..... میں نے سورج کی طرف سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھا اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر اس کا ارادہ معلوم کرنے کی کوشش کی ـــــ اُف! اس کی آنکھوں میں تو اس وقت بھی میرے لئے نفرت تھی۔ غصہ تھا اور برے ارادے تھے.....

اب کیا ہوگا ـــــ میرے دل نے مجھ سے سوال کیا تھا۔ اور قبل اس کے کہ میں اس پہلو پر سنجیدگی سے کچھ سوچتا۔ سورج نے اپنی تمام تر قوت کے ساتھ مجھے دبوچ لیا۔ ہاتھی کی سونڈ جیسے اس کے ان گنت لمبے اور مضبوط ہاتھوں نے پوری طرح سے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور مجھے اس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا

جیسے کوئی پل میں میرا دم گھٹ جائے گا۔

"کتنا بڑا نادان ہے۔ کہتا ہے سورج تجھے مار ڈالے گا۔" یہ آواز بھیڑ کے کسی کونے سے آئی تھی۔ پھر فوراً ہی ایک دوسری آواز ابھری تھی۔ "شاید پاگل ہو گیا ہے۔ سورج کا منکر ہو گیا ہے۔ عظیم و برتر سورج کو قاتل تصور کرتا ہے۔ اب اگر یہ اپنے شور و شغب کو بند نہیں کرتا ہے تو اسے پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا جائے....."

میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ لیکن سورج کا دور دور تک کہیں پتہ نہ تھا۔ یہ کل کا دن تھا اور آج جب کہ اس واقعے کو گذرے ہزاروں سال ہو چکے ہیں۔ میں اسی حالت میں ہوں..... پچویشن آج بھی وہی ہے..... پرندے کے بازو ٹوٹ چکے ہیں..... جسم لہولہان ہے۔ اور ــــ سورج کا کہیں نام و نشان نہیں ہے..... منظر وہی ہے..... منظر وہی تھا..... منظر وہی رہے گا.....

اختر واصف

اختر واصف ابن نور محمد انصاری، یکم مارچ ۱۹۵۶ء کو آرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی علمی لیاقت آئی۔ اے ہے۔ فی الحال سرکاری ملازمت کر رہے ہیں آپ کی ادبی زندگی کا آغاز باضابطہ طور سے کہانیوں کی شکل میں ۱۹۷۲ء سے ہوا اب تک ان کی کہانیاں تحریک، جواز، آہنگ اور خمار میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ ریڈیو سے بھی کئی کہانیاں نشر ہوئی ہیں۔ فن کے لحاظ سے آپ کے

• جوہر نظامی	۸۳
• محمودہ خاتون	۸۴
• حسن عظیم آبادی	۸۵
• رضا نقوی واہی	۸۶
• فضل امام واقف	۸۸
• دانش عظیم آبادی	۸۸
• رمز عظیم آبادی	۹۰
• نند کشور پرساد	۹۲
• نظر عظیم آبادی	۹۳
• منظر صدیقی	۹۴
• ڈاکٹر ہمدم عظیم آبادی	۹۵
• جعفر النساء جمال	۹۶
• نقی احمد ارشاد	۹۷
• غبار بھٹی	۹۸
• نشاط عظیم آبادی	۹۹
• ہوش عظیم آبادی	۹۹
• حسیر عظیم آبادی	۱۰۱
• سرور عظیم آبادی	۱۰۱
• کلیم عاجز	۱۰۳
• جمیل عظیم آبادی	۱۰۴
• فرید عمادی	۱۰۵
• نادم بلخی	۱۰۶
• ہاشم عظیم آبادی	۱۰۶
• شہزاد معصومی	۱۰۸
• صبا شیر	۱۰۹
• انیس عظیم آبادی	۱۱۰
• ڈاکٹر ممتاز احمد	۱۱۱
• اختر عظیم آبادی	۱۱۳
• یوسف خورشیدی	۱۱۴
• سعید رضا گہر	۱۱۶
• ندیم عظیم آبادی	۱۱۷
• احمد تبسم	۱۱۸
• قمر زاہدی	۱۱۹
• کیف عظیم آبادی	۱۲۰
• مختار احمد عاصی	۱۲۱
• ظہیر صدیقی	۱۲۲
• سحر عظیم آبادی	۱۲۳
• طلحہ رضوی برق	۱۲۴
• نواب حسین فردوسی	۱۲۵
• شکیب ایاز	۱۲۶
• متین عمادی	۱۲۷
• کاظم ہاشمی	۱۲۸
• رشید عارف	۱۲۹
• معین کوثر	۱۳۰

(۱۴) شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی سنہ ۱۱۶۳ھ مطابق سنہ ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۲۳۸ھ مطابق سنہ ۱۸۲۳ء میں وفات پائی۔ محلہ لودیکٹرہ (عظیم آباد) میں آپ کا مزار ہے۔ آپ ہندوستان کی شاعری میں ثانیٔ میر تسلیم کئے گئے ہیں۔

ہوئے ہیں ہم ضعیف اب دیدنی رونا ہمارا ہے
مژہ پر اپنے آنسو صبح پیری کا ستارا ہے
خدا جانے نہاں اس آشکارا میں ہے کیا کیا کچھ
خوشا نے اہلِ دل جس پر نہاں بھی آشکارا ہے
شروعِ عشق راسخ کہتے ہو جاتا ہے دل ڈوبا
کنارے میں یہ اس دریا کے حال ایسا تمہارا ہے

خاک ہوں پر توتیا ہوں چشم مہر و ماہ کا آنکھ والا رتبہ سمجھے مجھ غبار راہ کا

(۱۵) مرزا امان علی تخلص ذبیح عظیم آبادی، مرزا ابراہیم علی خاں کے خلف ارشد تھے۔ بڑے خوش بیان و ظریف تھے۔ فی الجملہ ہکلاتے تھے ان کی غزل کا ایک شعر یہ ہے۔

یہ ہجر میں تمہارے پھپھٹ گیا کلیجہ مدتیں گذر گئیں پہ پاس تم نہ آئے

(۱۶) حکیم ابوالحسن محزوں۔ شاگرد رشید راسخ عظیم آبادی سنہ ۱۲۱۶ھ میں انتقال کیا۔

ہم جو کچھ چاہیں بھی ان سے تو انھیں کو چاہیں
ماسوا سے نہیں کچھ کام طلبگاروں کو

(۱۷) قاضی مخدوم عالم مخدوم ابن حضرت قاضی سید سلطان عالم (پھلواری شریف، پٹنہ) سنہ ۱۲۱۶ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۲۷۰ھ میں انتقال کیا۔

کشتہ کر ناب۔ دشوار ہے اسے شعلہ رو۔ بیقراری سے دل بیتاب یارو ہو گیا

پسندیدہ افسانہ نویس غیاث احمد گدی اور انتظار حسین ہیں۔ آج کل شہر پٹنہ میں مستقل طور پر مع والدین سکونت پذیر ہیں۔ نمونۂ تخلیق میں آپ کی ایک کہانی بعنوان "دیواریں ہنستی ہیں" کے چند اقتباسات یہ ہیں:۔

اس وقت ایسا تھا کہ دیوار کی دونوں جانب آبادی تھی۔ دونوں طرف کے لوگ ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے۔ دراصل دیوار کے ابھرنے سے قبل اس طرف اور اس طرف کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔ لیکن جس دن وہ دیوار مکمل ہوئی اسی دن چاروں سمت میں پھیلی ہوئی ہواؤں نے بار بار یہ اعلان دہرایا کہ اس طرف کے لوگ اس طرف کے لوگوں سے نہیں مل سکتے۔

تب ایک واقعہ ہوا..... جانے کیسے اچانک ہی یہ خبر عام ہوگئی کہ اس طرف کا ایک شخص روز دیوار کو پھلانگ لگا کر اس طرف چلا جاتا ہے۔ اس طرف ایک دبلی پتلی سانولی سی لڑکی ہے۔ دونوں روز رات کے وقت، جب اندھیرا سناٹے کے ساتھ لپٹ کر سویا ہوتا ہے۔ ملاقات کے چراغ روشن کرتے ہیں اور آبادی سے ذرا ہٹ کر واقع ایک تالاب کی سیڑھی پہ دھر دیتے ہیں کہ ان چراغوں کا عکس تالاب کے ہلکے ہلکے ہلکورے لیتے پانی میں پھیلتا رہتا ہے۔ سناٹا رہتا ہے۔ اس خبر نے دونوں ہی جانب آگ سی لگا دی۔ ایک عجیب نفرت کی آگ جس نے دونوں ہی جانب جانے کتنے لوگوں کو جھلسا کر رکھ دیا۔ تب ایسا ہوا کہ ایک بار پھر وقت کے ہاتھ دراز ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے پہلی دیوار سے بھی اونچی ایک دوسری دیوار اٹھ کھڑی ہوئی اور لوگ باگ مطمئن ہو گئے کہ اب کوئی اس طرف سے اس طرف نہ جا سکے گا..... کہ اب کوئی اس طرف سے اس طرف نہ آ سکے گا۔

آج میرے سامنے کھڑی ان دیواروں کی ہڈیاں بالکل کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ ان کی

منڈیروں پر کائی اور سبزہ اگ آیا ہے اور ان کے پتھر اپنی جگہ چھوڑ رہے ہیں۔ یہ دیوار ..... یہ دیواریں تو میری ایک ضرب بھی نہیں سہہ سکیں گی۔ میں نے اپنے سامنے کھڑی دیواروں پہ نظر کی اور ایک قہقہہ لگایا..... لیکن میرا قہقہہ ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ان دیواروں نے بھی ایک قہقہہ مارا۔ میں ایک لمحہ کے لئے تو مبہوت رہ گیا۔ پھر دل ہی دل میں مسکرایا

یہ دیوار..... اس دیوار نے قہقہہ کیوں لگایا؟ آخر کس بل بوتے پر یہ دیوار قہقہہ مار رہی ہے؟ میں نے ادھر دیکھا لیکن دور دور تک ان دیواروں کی مدافعت کرنے والا کوئی نہ تھا۔ دفعتاً میری نگاہ خود اپنے وجود کے اندر اترتی چلی گئی۔ اور میں ایک دم سے مبہوت رہ گیا کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں پچاسوں دیواریں ہیں۔ خود میرے وجود کے اندر پچاسوں دیواریں ہیں جو بڑی شان و شوکت سے سر اٹھائے قہقہہ مار رہی ہیں۔

قیصر زاہدی

قیصر اقبال اصلی نام، اور قیصر زاہدی ادبی نام، ابن قمر زاہدی ۱۲ جون ۱۹۵۶ء کو نوادہ ضلع کے ایک گاؤں، پتھوری میں پیدا ہوئے۔ بی۔ اے (آنرز) کرنے کے بعد ایل۔ ایل۔ بی کر رہے ہیں۔

ان کی ادبی زندگی کا آغاز افسانوں کی شکل میں مارچ ۱۹۷۶ء سے ہوا۔ اب تک آپ کے افسانے بیسویں صدی، آواز، روشن ادب اور مسائل وغیرہ رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی افسانے ریڈیو سے بھی نشر ہو چکے ہیں۔ فن کے لحاظ سے پریم چند، منٹو، واجدہ تبسم، اقبال، فیض اور مجاز آپ کے پسندیدہ ادبا و شعرا ہیں

فی الحال شہر پٹنہ کے محلہ عالم گنج میں اپنے والد کے ہمراہ سکونت پذیر ہیں۔ نمونۂ تخلیق میں ان کے ایک افسانہ بعنوان "مٹھی بھر زمین" کے چند اقتباسات یہ ہیں :-

دونوں امید کے سہارے چل کھڑے ہوئے۔ کیوں کہ ان لوگوں نے سن رکھا تھا کہ یہ دھرتی بہت بڑی ہے۔ کچھ دور چلنے پر انھیں ایک سہ منزلہ عمارت نظر آئی۔ ان لوگوں نے سوچا آج کی رات یہاں سائبان پر کاٹ لی جائے تو پھر کل کوئی انتظام کیا جائے گا مگر یہ لوگ جیسے ہی حویلی کے دروازے پر پہونچے تھے کہ کتوں نے گلا پھاڑ پھاڑ کر بھونکنا شروع کر دیا۔ شاید اس لئے کہ ایسا نہ ہو کہ آج ان کے حصے کا سالن اور دودھ ان لوگوں کو دے دیا جائے مگر ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ اگر کوئی بھکاری آجاتا تو اسے وہ سوکھی روٹی دے دی جاتی تھی جسے یہ ایسیشین کتے سونگھنا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ یا پھر دس پیسے کا ایک سکہ ان کی جانب اچھال دیا جاتا تھا۔

نتھوا نے آسمان کی طرف دیکھا۔ شرم سے سورج دھرتی میں گڑ چکا تھا۔ اب سورج کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ تاریکی تیزی سے اپنا سیاہ پنکھ پھیلا رہی تھی۔ وقت بہت کم تھا۔ اس لئے ان لوگوں نے آگے بڑھنا ہی بہتر سمجھا۔ دور مندر میں دیا جلتے دیکھ کر امید کی لو پھر تیز ہو گئی۔ ان کے قدم تیزی سے مندر کی طرف اٹھ رہے تھے۔ "نہیں ٹھہرایا تو کیا ہوا..... کیا کوئی بھگوان کے گھر میں بھی نہیں ٹھہرنے دے گا..... کیا کوئی بھگوان کے گھر سے بھی نکال دے گا..... نہیں، نہیں..... مندر تو بھگوان کا گھر ہوتا ہے۔"

نتھوا ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور سہم کر بولا "سرکار آج رات یہاں مندر کے اسارے پر ٹھہرنے دو۔ کل ہم لوگ کوئی انتجام (انتظام) کر لیں گے۔" "کیا کہا تو یہاں مندر میں رہے گا؟ یہ دھرمشالہ نہیں ہے۔ مندر ہے مندر، بھگوان کا گھر۔ یہ پوتر استھان ہے۔" "دیا کرو ہم پر دیا کرو، اس وقت ہم کہاں جائیں گے۔ اس ٹھنڈ میں باہر کھلے میں

رہ سکتے ہیں۔" "نکل جا یہاں سے۔" پجاری نے گرج کر کہا۔ اس وقت نتھوا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسوؤں کے قطرے گرنے لگے۔ اس وقت ان لوگوں کو یہ دھرتی بہت ہی تنگ نظر آرہی تھی۔ اتنی چھوٹی کہ جس پر یہ لوگ اپنا ایک قدم رکھ کر کھڑے بھی نہیں ہو سکتے تھے۔

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی نتھوا اور دکھنی تیزی سے اسپتال کی طرف بھاگ رہے تھے۔ انجکشن..... آکسیجن..... بچے کی حالت سدھرنے کے بجائے بگڑتی ہی جارہی تھی اور آخر کار شام ہوتے ہوتے بچے نے اس ظلم وستم کی دنیا سے اپنا رشتہ توڑ لینا ہی بہتر سمجھا۔ اسے چشتی، گوتم اور نانک کی سرزمین راس نہ آئی۔

رحمان شاہی

ظل الرحمٰن اصلی نام اور رحمان شاہی قلمی نام، ابن سید شاہ فضل الرحمن کی پیدائش سیدپور میں ۲ فروری ۱۹۵۸ء کو ہوئی۔ آپ کی علمی لیاقت ایم۔ کام (آخری سال) پٹنہ یونیورسٹی ہے۔

اردو ادب میں براہ راست سعادت حسن منٹو اور سہیل عظیم آبادی کو اپنا استاد تصور کرتے ہیں۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۷۴ء سے ہوا جب انھوں نے پہلی کہانی لکھی۔ لیکن اس سے قبل شعر وسخن سے رغبت رکھتے تھے۔ جسے بعد میں ترک کر دیا۔ نثر نگاری میں انھوں نے اب تک آٹھ۔ دس کہانیاں اور اتنے ہی مضامین لکھے ہیں۔ جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی کہانیاں اور مضامین ریڈیو سے بھی نشر ہوئے ہیں۔ فنی طور پر آپ کے پسندیدہ ادبار و شعراء بالترتیب جناب

سعادت حسن منٹو، سہیل عظیم آبادی، کرشن چندر، فیض احمد فیض اور جمیل مظہری ہیں۔ دو سال قبل ایک صحتمند دو ماہی رسالہ بنام خمار (پٹنہ) نکال رہے تھے، جو بعد میں بند ہو گیا۔ ان دنوں شہر پٹنہ کے محلہ عالم گنج میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہیں۔ نمونہ تخلیق میں ان کے ایک افسانہ بعنوان "گنہگار فرشتہ" کے چند اقتباسات منسلک ہیں :۔

چندا ایک مشہور رقاصہ تھی۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اس کے حسن کے شیدائی اس کے دیدار کے لئے دن دن بھر اس کی گلی کا چکر لگاتے تھے۔ ہرنی جیسی خوبصورت آنکھیں وہ جدھر بھی اٹھاتی ایک قیامت سی آجاتی تھی۔ بلوا تو اپنا دل بیٹھا تھا۔ اور وہ بھی بلوا پر مرمٹی تھی۔ وہ اپنے جسم کا سودا نہ کرتی تھی۔ لیکن بلوا کی بات اور تھی ..... بلوا نے کئی بار چندا سے کہا تھا کہ وہ یہ گندی زندگی چھوڑ دے۔ ایک نئی دنیا بسائے۔ لیکن چندا ایک دم اداس ہو جاتی تھی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ کرب کے سائے رینگنے لگتے تھے۔ اور وہ بے بسی اور مایوسی سے بلوا کو تکنے لگتی تھی۔ پھر کہتی تھی ــــ "بلوا! میں تو ایک طوائف ہوں اور تو ایک مفلس ہے۔ اور افلاس دنیا کا بدترین گناہ ہے۔ بھلا گناہ بھی کبھی کسی گھر کی رونق کا باعث بنا ہے؟ میں کسی گھر کی رونق نہیں بن سکتی۔ طوائف ہی ہوں نا..... میری قدر، میری عزت چکلوں پر ہی کی جاتی ہے۔ میری بستی، میرا سماج، میری دنیا..... سب کچھ یہی کوٹھا ہے بھلا میں اسے چھوڑ کر کسی نئی دنیا میں کیسے جاؤں....."

شاید اسے نہیں معلوم تھا کہ طوائف قوم کی بیٹی، بہو یا بیوی نہیں۔ قوم کے سرپرستوں کا کھلونا ہوتی ہے۔ اور کھلونا ہر جگہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اسے سجانے کے لئے ایک خاص جگہ ہوتی ہے۔ اور طوائف کی جگہ اور اس کا مقام کوٹھا ہے۔ وہ کوٹھے پر ہی اچھی اور حسین معلوم ہوتی ہے۔

محبت ایک تبسم ہے جو اس تعصب اور نفرت بھری دنیا سے دور کسی پرنور جزیرے کے اندر بسنے والی پریوں کے نازک ہونٹوں پر نمایاں ہوتا ہے..... یہ ایک مقدس جذبہ ہے۔ جو خود بخود پیدا ہو کر کائنات کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ اور..... اور آج جو آوارہ اور خود غرض بھونرے تیرے گرد منڈلا رہے ہیں۔ ان کا تعلق تیرے جوان جسم سے ہے اور بھرپور شباب سے۔ جب تیرا شباب ڈھل جائے گا اور جوان جسم پر جب بڑھاپے کی حکمرانی ہو جائے گی تو یہ خود غرض بھونرے کسی دوسری جوان ہوتی ہوئی کلی کی طرف پرواز کر جائیں گے۔

"میں سنبل پور گاؤں کے ایک معمولی کسان کی بیٹی ہوں۔ میرا پریوار بہت چھوٹا تھا۔ باپو اور ماں کے علاوہ ایک چھوٹا بھائی تھا' رامو۔ میرا گاؤں ندی کے کنارے تھا۔ ایک مرتبہ اچانک گاؤں میں بھیانک سیلاب آیا۔ لوگ گھر سے بے گھر ہو گئے۔ بہت سارے لوگ پانی کے تیز دھارے میں بہہ گئے اور بہت سارے لوگ ڈوب گئے۔ جس وقت گاؤں میں سیلاب آیا تھا' اس وقت کڑاکے کی ٹھنڈ تھی۔ چنانچہ سیلاب آیا تو ٹھنڈک نے تھوڑے بہت بچے ہوئے لوگوں کو بھی مار ڈالا۔ اسی میں باپو اور ماں کا دیہانت ہو گیا۔ رامو کا کہیں پتہ نہ چلا۔ شاید وہ ڈوب گیا یا بہہ گیا۔ ایک دم چھوٹا سا تو تھا۔ میں کچھ دنوں تک کیمپ میں رہی اور پھر مجھے ایک سیٹھ اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ بہت ظالم آدمی تھا۔ اور ایک نمبر کا عیاش بھی۔ میں اس کے یہاں پرورش پانے لگی۔ میرا پھپنا سیٹھ اور اس کے آدمیوں کو شراب پلاتے گذر گیا۔" چندا چپ ہو گئی۔ بہت دیر تک چپ رہی پھر بولی۔ "ایک رات میں اپنے کمرے میں گہری نیند سے سوئی ہوئی تھی۔ اچانک سیٹھ اور اس کے چار ساتھی مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ اور ..... مجھے ننگا کر دیا....."

"چندا مجھے معاف کر دینا۔ میں......میں بہت بڑا گنہگار ہوں۔ ......لیکن بے قصور ہوں.........بالکل بے قصور......میری چندا ... ...میر.........ی..........." وہ چندا کے قدموں پر گر پڑا۔ اس کی زبان ہمیشہ کے لیئے خاموش ہو گئی۔ اور ایک راز اس کے سینے میں گھٹ کر رہ گیا۔

بلوا چندا کا سگا بھائی راموتھا۔

اور دیگر

بہار بالخصوص عظیم آباد میں ایسے بھی فنکار ہیں، جن میں فنی صلاحیت تو ہے لیکن چھپے ہوئے ہیں، جنہیں دوسرے لفظوں میں خفیہ فنکار کہہ سکتے ہیں۔ ان کے اسمائے گرامی ہیں: مرزا منظر نواب متخلص بہ منظر عظیم آبادی مرحوم، سید محمد مہدی ابن بسمل عظیم آبادی، سید قنبر علی خاں قنبر عظیم آبادی ابن منظر عظیم آبادی، شان الرحمن ابن سہیل عظیم آبادی، کوثر سہروردی مرحوم، نجمی عظیم آبادی مرحوم (ان دونوں سے بہت ساری امیدیں وابستہ تھیں مگر افسوس کہ جوانی میں موت پائی) محمد حسن آرزو عظیم آبادی، بدیع الزماں سحر، ڈاکٹر صدرالدین عزم، اسماعیل حسنین نقوی، سید شمیم احمد زمزم، محمد اشرف عظیم آبادی اور احسن شفیقی۔

اور دوسرے وہ فنکار جن کی ادبی زندگی کا آغاز ہو چکا ہے اور ان کی تخلیقات بھی منظر عام پر آنے لگی ہیں۔ ممکن ہے ان ہی لوگوں میں سے زیادہ تر لوگوں کا مستقبل تابناک ہو۔ اگر وہ اپنی ادبی خدمت میں لگے رہیں تب۔ ان فنکاروں کے اسمائے گرامی ہیں: قاسم خورشید، جاوید اشرف عظیم آبادی، صوفیہ پروین، نسرین کاظمی، عالم آرا، سید شاہ شمیم احمد منعمی، احمد بدر، یعقوب احمد قمر، اعجاز اعظم، نسیم اختر، رباب زیدی، فضل امام ملک، ابوالکلام عزیزی، پروین کاظمی

کتابیات

(۱) تاریخِ شعرائے بہار — از: سید عزیز الدین بلخی
(۲) تذکرہ مسلم شعرائے بہار — ,, حکیم سید احمد اللہ ندوی
(اوّل، دوئم، سوئم، چہارم، پنجم اور ششم جلد)
(۳) ہندو شعرائے بہار — از: فصیح الدین بلخی
(۴) بہار میں زبان و ادب کا ارتقاء — ,, اختر اورینوی
(۵) عظیم آباد ۱۹۷۱ء یادگار مشاعرہ — ,, محمد یوسف خورشیدی
(۶) پیشکش (شعری مجموعہ) ,, ,, ,, ,,
(۷) ساز و آواز (,,) ,, غضنفر نواب دانش
(۸) کلام بیتاب (,,) مرتبہ حمید عظیم آبادی
(۹) پروازِ غبار (,,) از: غبار بھٹی
(۱۰) وہ جو شاعری کا سبب ہوا (شعری مجموعہ) ,, کلیم عاجز
(۱۱) فکرِ جمیل (شعری مجموعہ) ,, جمیل مظہری
(۱۲) نوائے بیدل (شعری مجموعہ) از: عبدالمنان بیدل
(۱۳) عکسِ تمنا (,,) ,, نند کشور وپرساد نثر
(۱۴) متاعِ واہی (,,) ,, رضا نقوی واہی
(۱۵) اردو تنقید پر ایک نظر ,, کلیم الدین احمد
(۱۶) شاخِ لہو (افسانوی مجموعہ) ,, شفیع مشہدی
(۱۷) الاؤ (,,) ,, سہیل عظیم آبادی
(۱۸) کرچیاں (,,) ,, شمیم صادقہ
(۱۹) روشنائی کی کشتیاں (,,) ,, احمد یوسف
(۲۰) انوکھی مسکراہٹ (,,) ,, محمد محسن
(۲۱) ذکر و مطالعہ (مضامین کا مجموعہ) ,, محمد ذکی الحق
(۲۲) صنفِ انشائیہ اور چند انشائیے ,, ڈاکٹر سید محمد حسنین
(۲۳) سیرِ اردو — مرتبہ: وہاب اشرفی

رسائل

اختر اورینوی نمبر (آہنگ گیا)، افسانہ نمبر (آواز، دہلی)، شا
عظیم آبادی نمبر (زبان و ادب، پٹنہ)، معاصر (پٹنہ)، انشا،
(پٹنہ)، آجکل (دہلی)، شاعر (بمبئی)، صبح نو (پٹنہ)، آواز (دہلی)، گل کدہ (سیوان)
اور کل ہند مشاعرہ سووینیر (مارواڑی کالج کشن گنج)

ہم نے اپنے مخدوم لکھی ان کی انشاں کی جو بات نوک خامہ سے گرا جو رشحہ تارہ ہوگیا

(۱۸) خواجہ فیض اللہ فرحت معروف بہ شاہ غلام مخدوم عظیم آبادی سلسلہ ابوالعلائیہ سے منسلک تھے۔

ع گلِ چمن میں مری اشکوں سے بھر آئیں آنکھیں
یاد نرگس نے مجھے اون کی دلائیں آنکھیں

(۱۹) نواب مہدی علی خاں، تخلص مہدی خلف نواب جعفر حسین خاں فیض رئیس عظیم آباد، شاگرد راسخ عظیم آبادی۔

ع ہے محیط اس مرتبہ فیض ادس کے نور کا
ہے شرر ہے سنگ میں ہمسر چراغِ طور کا

(۲۰) حضرت غلام یحییٰ قدس سرہ تخلص حضور خلف شاہ محمد مظہر بن شاہ محمد اظہر۔ ۱۲۶۰ھ میں انتقال کیا۔

ع یہ عزمت نہیں اب تلک جس طرح حضور اتنے دن بھی گذر جائیں گے

(۲۱) شمس العلما مولانا حاجی شاہ محمد سعید حسرت ۱۲۳۱ھ میں پیدا ہوئے۔ فارسی اردو عربی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اردو اور عربی میں سعید تخلص فرماتے تھے۔

ع کیا تڑپ کر دلِ مجروح نے کی بے لطفی خوں سے تر دامنِ قاتل نہ ہوا تھا سو ہوا
پا گیا عشق مجازی سے حقیقت کو سعید للہِ الحمد کہ ـــ کامل نہ ہوا تھا سو ہوا

(۲۲) میر غلام حسین شورش عظیم آبادی، میر باقر حزیں کے شاگرد تھے۔ شاعری سے زیادہ تذکرہ نگاری میں شہرت پائی ان کے تحریر کردہ تذکرہ کا ایک قلمی نسخہ بورڈلین لائبریری آکسفورڈ سے کلیم الدین احمد صاحب نے پٹنہ یونیورسٹی کے لئے حاصل کیا ہے۔ تاریخ وفات ۱۱۹۵ھ اور قاضی عبدالودود صاحب کے مطابق ۱۱۹۲ھ ہے۔

ع جان تجھ بن رہا نہیں جاتا ۔ مجھ سے یہ دکھ سہا نہیں جاتا

(۲۳) حکیم محمد اسمٰعیل خاں صاحب رجسٹرار ہلسہ ضلع پٹنہ خلف مولوی محمد بخش خاں وکیل بانکی پور خدا بخش خاں (سی آئی ای) وکیل پٹنہ کے سنجھلے بھائی تھے۔ ۱۲۷۸ھ میں حضرت صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے۔

ع معشوق تو دنیا کے وفادار نہیں ہیں
غم کھانے کا مشتاق کے حامل نہیں معلوم

(۲۴) حیرتی محمد علی خاں، باشندہ عظیم آباد۔ راجہ پیارے لال الفتی کے شاگرد تھے۔ ۱۲۹۵ھ میں حیات تھے۔

ع اے خضر مرے واسطے آبِ حیات ہو
پانی ملے جو اس کے زنخداں کے چاہ کا

(۲۵) حکیم مولانا عبد الحمید پریشاںؔ ابن مولانا احمد اللہ صاحب ۱۲۴۵ھ میں پیدا ہوئے ۷۸ برس کی عمر پاکر ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء میں انتقال کیا۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں فکر سخن کیا۔

ع پیار وہ کرتے ہیں خفا ہو گیا ۔ ہائے میں کیا سمجھا تھا کیا ہو گیا
دل مرے پہلو سے جدا ہو گیا ۔ اے مرے اللہ یہ کیا ہو گیا
مر کے جو قاتل کے قدم پر گرا ۔ سجدۂ شکرانہ ادا ہو گیا
قتل پہ میرے انھیں رحم آ گیا ۔ دستِ ستم دستِ دعا ہو گیا

(۲۶) شاہ دیدار حسین دبھیؔ عرف شاہ آغا جان صاحب (محلہ سملی عظیم آباد) تقریباً ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۲۰ھ میں انتقال کیا۔ آپ کا ایک دیوان، دیوان دبھی بطور یادگار چھوڑا ہے۔ بیشتر نعت فرماتے تھے۔

ع خدا کی صفت و قدرت کا گر یقیں ہو جائے ۔ تو راز کلمۂ توحید دل نشیں ہو جائے

؎ دشمن نظر بچا کے دبے پاؤں ہٹ گیا
میں اپنے سر پہ کھیل کے مقتل میں ٹوٹ گیا

(۴۲) سید فضل حق، تخلص آزاد، موضع شاہو بیگہ ضلع گیا کے رہنے والے تھے لیکن ایک عرصہ تک آپ کا قیام عظیم آباد میں رہا۔ اس وقت آپ آزاد عظیم آبادی لکھا کرتے تھے۔ آپ نے غزلوں کے ساتھ نظموں کا بھی بڑا ذخیرہ اردو ادب کے لئے فراہم کر دیا۔ ۱۹۴۳ء (لگ بھگ ۸۰ برس کی عمر) میں وفات پائی۔

؎ میں اور اک شیریں ادا، صحنِ چمن، جام شراب
چاندنی تب شمع کافوری، لبالب حوضِ آب

(۴۳) سید شاہ محمد مہدی، تخلص مہدی خلف سید شاہ محمد یحییٰ ۱۲۸۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۵ء میں وفات پائی۔

؎ خاک ہے سب گر وطن کی یاد ہو   کچھ نہ ہو لیکن عظیم آباد ہو

(۴۴) نواب سید محمد رضا خاں عرف ننھا صاحب تخلص موجؔ ابن نواب سید ابن حسن خاں فطنتی ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۷ء میں انتقال کیا۔

؎ کہیں جا کر نہ چھپنا پڑے اس بزم میں اے موجؔ
بھلا یہ بے بلائے آپ کہاں مہمان جاتے ہیں

(۴۵) سید علی خاں، تخلص بیتاب عرف لاڈلے صاحب ابن عبد الکریم خاں تسلیم عظیم آبادی کی پیدائش ۱۸۷۷ء میں ہوئی اور ۱۹۴۸ء میں وفات پائی۔ غزل گوئی، قطعات، مسدس اور قومی نظموں کے علاوہ نثر نگاری میں بھی ایک خاص سلیقہ تھا۔ آپ کے کلام کا مجموعہ بعنوان "کلام بیتاب" کو حمید عظیم آبادی نے مرتب کر کے بزم شاد کے ذریعہ شائع کروایا۔ جو بہار اردو اکاڈمی کی قائم کردہ اردو میوزیم گیا ہے۔

؎ سرکی ہے نقاب اس رخ ہمشکل سے بیتاب   کہنا ہی پڑا مجھ کو بھی آخر کہ خدا ہے

(۴۶) ڈاکٹر مبارک حسین، تخلص مبارک عظیم آبادی ابن مولوی فدا حسین ۱۲۸۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۸ء میں وفات پائی۔

لالہ رخوں میں عمر گذاری اور بہاریں بھی لوٹیں
آج بھی گل سے گالوں والے مجھ کو مبارک پیارے ہیں

(۴۷) سید شاہ نور الرحمٰن عرف شاہ لال تخلص انور۔ محلہ کشمیری کوٹھی میں آپ کا مسکن تھا پچاس سال کی عمر میں ۱۹۱۷ء کو وفات پائی۔ آپ کا مزار کچی درگاہ میں ہے۔

مسکین ہوں غریب مصیبت زدہ ہوں میں
لائی ہے مجھ غریب کو حاجت وطن سے دور

(۴۸) شیخ علی باقر، تخلص آباد، ابن مولوی شیخ آغا جان، تلمیذ شاد۔ عمر بہت کم پائی۔ ۱۳۱۸ھ میں وبائی اسہال میں مبتلا ہو کر انتقال کیا۔ ان کی غزلوں کو ترتیب دے کر امداد صاحب نے دیوان موسوم بہ "خورشید عرفان" ۱۳۳۲ھ میں شائع کروا دیا۔

قبائے یار سے دعوائے خوش وضعی قیامت ہے
کہو گل سے ذرا چاک گریباں کو رفو کرے

(۴۹) حکیم محمد رضا خاں عرف چاری میاں تخلص فریاد عظیم آبادی خلف رستگار حسین خاں مرحوم۔ ۱۳۴۲ھ میں آپ کی عمر ۷۰ سال کی تھی۔ حضرت شاد عظیم آبادی سے شرف تلمذ تھا۔ آپ کے کلام میں مشاقی اور پختگی نمایاں ہے۔

نہیں ہم کو درکار فریاد کچھ بھی سخن صاف و شیریں زباں چاہتے ہیں

(۵۰) قاضی عبد الوحید تخلص وحید۔ سن ولادت ۱۲۸۹ھ اور سن وفات ۱۱ ربیع الاول ۱۳۳۶ھ ہے۔ آپ کا کلام گلدستہ "فردوس خیال" میں چھپا کرتا تھا۔

؎ آرام نہیں ملتے کہ حسرت نہیں ملتی
کیا شیخی ہے کہ اس دل کو بدولت نہیں ملتی

(۵۱) سید شاہ محی الدین عرف شاہ کمال عظیم آبادی ابن شاہ مبارک عظیم آبادی ۱۲۹۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۳۵۹ھ میں وفات پائی۔ آپ کا دیوان مرتب تھا۔ جو ضائع ہو گیا۔

؎ آفت ہے طلب اے دل ناشاد کسی کی
سب کچھ کرے انساں نہ کرے یاد کسی کی

(۵۲) محمد عزیز الحق ہاشمی تخلص عزیز عظیم آبادی ابن مولوی شیخ اکرام الحق مرحوم ۱۳۴۳ھ میں آپ کی عمر پچاس سال تھی۔ تاریخ گوئی میں دخل تھا۔ ان کے کلام میں نازک استعاروں اور تخیل کا حسن نمایاں ہے۔ شاد عظیم آبادی سے تلمذ تھا۔

؎ حد در مرنے پہ بھی دل کو دکھانے سے نہ باز آیا
بہت رویا عزیز ایکدن جو گذرا اس کے مدفن سے

(۵۳) سید عنایت حسین امداد عظیم آبادی کے متعلق جناب غضنفر نواب دانش صاحب بتاتے ہیں کہ "آپ محلہ حاجی گنج (لال اٹھی) کے کھاتے پیتے چھوٹے موٹے رئیس تھے۔ ۱۲۹۳ھ میں پیدا ہوئے اور غالباً ۱۳۷۳ھ میں وفات پائی۔" جناب شاد عظیم آبادی کے تلامذہ میں سے تھے۔

؎ بڑا ادب مرے کھوئے ہوئے ہونے کیا
امتیاز شرف خود رگ گلوئے کیا

(۵۴) بابو بھوانی پرساد آزاد، ساکن محلہ کالی استھان پٹنہ۔ رائے اسری پرساد عطا کے حقیقی بھتیجے تھے۔ ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ شاد سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ ان کے کلام کا مجموعہ موسوم بہ دیوان آزاد ہے۔ جو آج بھی مخطوط

اسکول پٹنہ سٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔ ۱۹۳۵ء میں انتقال کیا۔

؎ نہ اس سراکا کبھی بند کارخانہ ہوا
کوئی سحر تو کوئی شام کو روانہ ہوا

(۵۵) مولوی حفیظ بلخی مرحوم خلف ڈاکٹر غیاث الدین بلخی مرحوم ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے اور ساٹھ سال کی عمر میں ۱۹۳۶ء کو ملک برما میں انتقال کیا۔

؎ وہ پھر عالم خیال ہے جو لائے امید
ناکامیوں سے تنگ دل منتشر نہ ہو

(۵۶) سید عزیز الدین بلخی، تخلص رازؔ عظیم آبادی خلف ڈاکٹر غیاث الدین بلخی "تاریخ شعرائے بہار" آپ ہی کی تصنیف ہے۔ ۱۹۳۵ء میں انتقال کیا۔

؎ منڈھتا ہے رازؔ عشق کو اپنے گلے عبث
ناداں! منڈھے چڑھا نہ سکے گا یہ بیل تو

(۵۷) سید مرتضیٰ نواب، تخلص مفتونؔ عظیم آبادی ابن حاجی نواب سید اصغر حسین عرف سید وزیر نواب۔ آپ تغزل میں دسترس رکھتے تھے۔ مرثیے، خمسے، سلام، مناجاتیں اور مختلف نظمیں خوب لکھی ہیں۔ شادؔ عظیم آبادی سے تلمذ تھا۔ تقریباً چالیس سال کی عمر میں بہ عارضۂ طاعون ملک بقا کی طرف ۱۹۱۷ء میں رحلت فرمائی۔

؎ عشق میں ہو گئے مجذوب سے بدتر مفتونؔ
کبھی مسجد میں پڑے ہیں کبھی میخانے میں

(۵۸) سید علی حیدر، تخلص شہیدؔ اعظیم آبادی ابن سید شاہ ولی حیدر ولی ۱۲۹۸ھ میں پیدا ہوئے۔ شادؔ عظیم آبادی سے تلمذ تھا۔

؎ سنے گا کوئی تو محشر میں مدعا اپنا بس ایک ہے یہی لے دے کے آسرا اپنا
کریگا تو نہ عداوت یہ دل کو ڈھا رہی ہے کہ تیرے دوست سے ملتا ہے سلسلہ اپنا

(۵۹) مرزا اعلیٰ رضا تخلص ضیا ابن مرزا اعلیٰ قدر ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کا ایک دیوان انیس سال کی عمر میں ردیف وار مرتب ہو گیا تھا۔ جو ان کے انتقال کے بعد "ریاض شاداب" بہ دیوان ضیا کے نام سے شائع ہوا۔ ایک حسینہ و مغنیہ پر عاشق ہوئے۔ ناکام ہونے پر عاشق و معشوق دونوں نے دو مختلف مقامات پر ایک ہی روز ایک ہی ساعت میں ۲۷ اپریل ۱۹۰۱ء کو خود کشی کر لی۔

؎ پکارتی ہے سرِ شام دل کی ویرانی
چراغ دے کوئی اجڑے ہوئے مکاں کیلئے

(۶۰) ڈاکٹر محمد عظیم تخلص عظیم عظیم آبادی کی پیدائش ۱۸۸۰ء کو پٹنہ سٹی میں ہوئی شعر و شاعری کے علاوہ آپ نے کئی تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ اصناف سخن میں زیادہ تر نظمیں ہی لکھا کرتے تھے۔ آپ کی نظموں کا مجموعہ بنام "گل نغمہ" شائع ہو چکا ہے۔

؎ خوشی سے مجھ کو کیا لذت یاب حسرت ہوں
طرب کی مجھ کو کیا پروا کہ میں محروم عشرت ہوں

(۶۱) شیو نرائن چودھری عارف خلف بابو لالہ چودھری ساکن محلہ حاجی گنج عظیم آباد۔ سن ولادت ۱۸۸۶ء ہے۔ اردو سے خاص شغف رکھتے تھے۔ اور تصوف کی کتابوں کے مطالعہ کا بھی شوق تھا۔ شاد کے شاگرد تھے۔

؎ ازل سے لائے جو مستی اسکی خبر نہ گئی
جو تھی ضمیر کے اندر وہ رنگ و بو نہ گئی

(۶۲) سید شاہ حامد حسین تخلص حامد عظیم آبادی ۱۳۰۱ھ میں پیدا ہوئے خانقاہ شاہ ارزاں پٹنہ کے سجادہ نشیں تھے۔ آپ کے ایک شعر کا یہ مصرع جو بہت مشہور ہے۔

تھا مقدر میں عزرائیل کے شیطاں ہونا

نکلے جو دل سے آہ تو کیوں کر اثر نہ ہو
ممکن نہیں کہ سنگ سے پیدا شرر نہ ہو

(۶۳) سید نظام الدین بلخی ابن ڈاکٹر ضیاء الدین بلخی ۲۲ مارچ ۱۸۸۲ء کو عظیم آباد کے محلہ بخشی میدان میں ہوئی۔ شاعری میں حضرت داغ سے تلمذ تھا۔

سراپا عشق ہے بلخی سراپا دل نہ بن جائے
بھرا گھر لوٹ میں اجڑی ہوئی منزل نہ بن جائے

(۶۴) سید محمد حسین، تخلص نصیر خلف اکبر حضرت شائق عظیم آبادی، سکونت محلہ نون گولہ عظیم آباد۔ ۱۳۴۲ھ میں آپ کی عمر ۴۲ سال تھی۔ شاعری کا ذوق بچپن سے تھا۔ ۱۹۱۰ء میں شاد کے شاگرد ہوئے۔

خوب وحشت میں بٹ لوں گا مزہ آئے گا
میرے دامن سے اگر دامنِ کہسار بندھے

(۶۵) غلام رسول تخلص حسرت عظیم آبادی ۱۳۰۳ھ میں پیدا ہوئے۔ شاد عظیم آبادی سے عرصۂ دراز تک تلمذ رہا۔

کبھی دنیا کی طرف رخ نہیں کرتے حسرت جنکا شیوہ ہے قناعت جنہیں ہمت والے

(۶۶) مرزا واجد حسین، تخلص یاس پھر بعد میں یگانہ (یگانہ چنگیزی) تخلص کیا۔ ۱۸۸۳ء میں عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ اور فروری ۱۹۵۶ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ پہلے انھوں نے بیتاب تلمیذِ شاد سے مشورہ سخن لیا۔ بعد میں خود حضرتِ شاد سے اصلاح لینے لگے۔

بجھ گیا دل کا کنول کشمکشِ شوق کجا
شمعِ خاموش کا کیونکر کوئی دیوانہ بنے

(۶۷) سید محی الدین تخلص تمنا ابن سید شاہ نذیر الحق فائز ۱۳۰۵ھ میں پیدا ہوئے۔ لسان الہند کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔

ع شبِ امید مرے گھر سے پشیمان گئی
میں اسے جان گیا وہ مجھے پہچان گئی

(۶۸) پرویز، تخلص مسلمؔ عظیم آبادی ابن محمد یوشع ۱۳۰۵ھ میں پیدا ہوئے
تقریباً گیارہ کتابوں (سبھی نثری) کے مرتب اور مصنف ہیں۔

ع بسی ہے ریشے ریشے میں مرے بوئے چمن مسلمؔ
قفس میں بھی نہ چھوٹا ہے نہ چھوٹے گلستاں مجھ سے

(۶۹) فصیح الدین بلخی، تخلص فصیحؔ عظیم آبادی، بلخی لنسبی نسبت۔ والد ماجد
کا نام ڈاکٹر غیاث الدین بلخی ہے۔ تاریخ ولادت ۱۸۹۵ء ہے۔ موصوف کی
تصنیفات تاریخ مگدھ، تذکرہ نسوانِ ہند اور ہندو شعرائے بہار ہے۔

ع انساں اس جہاں میں برابر ہیں اے فصیحؔ
کم ہے نہ کوئی اپنی نظر میں زیادہ ہے

(۷۰) سید عبدالحسین خاں عرف ججو نواب تخلص برقؔ، سکونت محلہ
مغلپورہ، عظیم آباد۔ شاعری میں زبان و خیالات کا خیال رکھتے تھے۔ شاد سے تلمذ
تھا۔ بہ عارضۂ سل جوانی میں رحلت کی۔

ع اے برقؔ اپنے جامۂ کہنہ کو سل تو لے
کیا جانیں کس گھڑی نہ آئے بہار کی

(۷۱) نواب صادق حسین خاں، تخلص نہالؔ۔ والد ماجد کا نام میر جعفر
حسین جو شادؔ عظیم آبادی کے حقیقی بھانجے اور نصیر حسین خیالؔ کے بھائی تھے۔ نظمیں
اور نثر بھی اعلیٰ درجہ کی لکھتے تھے۔ حضرت شادؔ سے تلمذ تھا۔ ۱۳۲۱ھ میں آپ کی
عمر تقریباً ۳۵ سال کی تھی۔

ع سوتے ہیں آ پڑی ہیں لٹیں روئے یار پر
ملتی ہے چاندنی مہ کامل گہن میں ہے

- شمیم فاروقی ۱۲۱
- شہلا نگار شمسی ۱۳۲

حصہ دوم (منثورات)

- قاضی عبدالودود ۱۳۴
- کلیم الدین احمد ۱۳۸
- محمد ذکی الحق ۱۴۱
- ضیا عظیم آبادی ۱۴۴
- قیوم خضر ۱۴۷
- نذر امام ۱۴۸
- سید محمد حسنین ۱۵۱
- ناصر زیدی ۱۵۲
- عبدالمغنی ۱۵۵
- اسلم آزاد ۱۵۷
- قیصر رضا ۱۶۰
- اعجاز علی ارشد ۱۶۳

افسانہ نگار

- محمد محسن ۱۶۷
- اختر اورینوی ۱۷۰
- سہیل عظیم آبادی ۱۷۳
- شکیلہ اختر ۱۷۶
- شمیم مظفرپوری ۱۷۸
- احمد یوسف ۱۸۰
- شبیر احمد ۱۸۳
- شفیع مشہدی ۱۸۵
- ذکیہ مشہدی ۱۸۸
- رضوان احمد ۱۹۱
- شمیم صادقہ ۱۹۴
- عبید قمر ۱۹۷
- شوکت حیات ۱۹۹
- اعجاز شاہین ۲۰۱
- افتخار عظیم چاند ۲۰۳
- فخرالدین عارفی ۲۰۶
- اختر واصف ۲۰۷
- قیصر زاہدی ۲۰۹
- رحمان شاہی ۲۱۱
- اور دیگر ۲۱۵
- کتابیات ۲۱۶

(۷۲) سید شاہ سعید الدین احمد تخلص کیف عظیم آبادی خلف حکیم مولوی وحید الدین شفق مرحوم ۱۳۵۲ھ بعمر ۳۴ سال میں وفات پائی۔ شاد عظیم آبادی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔

ع تم وفا سے نہ کیف باز آؤ ہیں جو وہ بے وفا تو ہونے دو

(۷۳) محمد حسان جعفری تخلص حسان۔ جناب رنجور عظیم آبادی کے فرزند تھے۔ تقریباً ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۸ء میں انتقال کیا۔ شاعری میں اپنے والد ماجد سے تلمذ تھا۔ آپ نے انگریزی نظموں اور افسانوں کے بھی ترجمے کئے ہیں۔

ع فریب ہستی موہوم ہوا سے حسان کیا کھائیں
کہ ہم تو اس طلسم دہر کو باطل سمجھتے ہیں

شاعری کے ساتھ نثر نگاری کے میدان میں بھی عظیم آباد کبھی پیچھے نہیں رہا چونکہ یہاں کی مٹی ادبی طور پر بہت زرخیز ہے، اس لئے نثر نگاری میں بھی پیش پیش رہا ہے۔ تاریخ کے اوراق الٹنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہار کے اردو نثر کے آغاز میں اسلامی مذہبیت کا تیز رنگ تھا۔ اس طرح یہ کہا جانا درست ہے کہ بہار کی ابتدائی اردو نثر اسلامیت کے دائرے میں پرورش پائی ہے۔ صوفیائے کرام اور اہل دور علماء نے ترویج و تائید اسلام کی خاطر مختلف مذہبی رسالے لکھے۔ بہار بالخصوص شہر عظیم آباد کے علمائے صادق پور نے بھی اردو نثر کی تخلیق میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ مزید عظیم آباد کے نثر نگاروں کی بھی ایک طویل فہرست ہے۔ لیکن ان میں چند نثار کے بارے میں بھی ذہن نشین کرتے چلیں۔ جو اردو ادب میں اپنی ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔

قدیم نثار

(۱) حضرت عماد الدین قلندر پھلواروی ۱۰۶۳ھ میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۱۲۴ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ کی تصنیف ایک مختصر رسالہ بعنوان "سیدھا

ہے۔ جسے تمنا عمادی مجیبی پھلواروی شریف عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سٹی کے کتبخانہ سے لے کر ڈھاکہ چلے گئے۔ اس رسالہ کی نقل رسالہ معیار پٹنہ کے مارچ ۱۳۶ء میں تین بار شائع ہو چکی ہے۔

● حضرت ظہور الحق ظہور (۱۱۷۰ھ تا ۱۲۳۴ھ) کے چار نثری رسالے نماز، فضائلِ رمضان، فیض عام اور شب النبی ہیں جو منگل تالاب خانقاہ عمادیہ پٹنہ سٹی کے کتبخانہ میں محفوظ ہیں۔ جس کا انکشاف شاہ غلام حسنین نے کیا تھا۔ جسے ڈاکٹر اختر اورینوی نے اپنی کتاب "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء" میں ذکر کیا ہے۔

● حضرت محمد تقی بلخی، حضرت ظہور الحق کے ہم عصر تھے۔ آپ کی کتاب احکام کا قلمی نسخہ پروفیسر ذکی الحق (سابق پروفیسر بی۔ این کالج پٹنہ) کے پاس ہے۔ جس کا انکشاف اختر اورینوی مرحوم نے اپنی کتاب "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء" (۱۹۵۶ - ۵۸) میں کیا ہے

● عالم علی عظیم آبادی، نے ۱۲۵۷ھ میں میر محمد تقی خیال کی مشہور کتاب "کوستانِ خیال" کا فارسی سے اردو ترجمہ کیا تھا۔

● مولانا محمد احسن گیلانی (۱۲۶۶ھ) ضلع پٹنہ کے رہنے والے تھے "اردو نثر کی پہلی کتاب" کے عنوان سے ان کا ایک مضمون رسالہ ندیم گیا کے بہار نمبر میں ۱۹۳۲ء کو شائع ہوا تھا۔

● مولانا ولایت علی زبیری صادقپوری حضرت تاج فقیہہ مدنی ثم منیری کے اخلاف میں سے تھے۔ ردِ شرک، رسالہ عمل بالحدیث، اربعین فی المہدیین، رسالہ دعوت، تیسیر الصلوٰۃ، رسالہ شجرہ، باثمرہ، تبیان الشرک آپ کی تصانیف ہیں۔

● مولانا عنایت علی صادقپوری عظیم آبادی، مولانا عنایت علی کے منجھلے بھائی اور ان کے شریک کار تھے۔ آپ نے بھی نثر میں کافی کارنامے انجام دیئے

ہیں۔

● مولانا فیاض علی، مولانا الٰہی بخش صادقپوری کے بیٹے تھے۔ مولانا ولایت علی کے انتقال کے بعد (۱۸۹۴ء کے بعد) سرحد سے پٹنہ واپس آ گئے تھے۔ پھر چند سالوں کے بعد سرحد افغانستان کی طرف ہجرت کر گئے اور وہیں وفات پائی۔ رسالہ "فیض الفیوض" آپ ہی کی تصنیف ہے۔

● پروفیسر عبدالغفور شہباز عظیم آباد کے جانے پہچانے ادیب اور شاعر تھے۔ آپ کی پیدائش تقریباً ۱۸۸۵ء (بقول ذکی الحق: ذکر و مطالعہ) میں ہوئی۔ رباعیات شہباز، خیالات شہباز، بیاض شہباز (قلمی)، مثنوی چہار عشق، مثنوی پنجۂ خورشید، تفریح القلوب (شعری تصنیفات) کے علاوہ ان کا سب سے اہم کارنامہ ان کی بیشل تصنیف "زندگانی بے نظیر" ہے، جو ۱۹۰۱ء میں چھپی تھی۔ اس کے ماسوا انھوں نے بہت سے مضامین اور کچھ کتابوں پر دیباچے لکھے ہیں۔ جس سے ان کی نثر کے ایک مخصوص و منفرد، جان دار اور تابناک اسلوب کا پتہ چلتا ہے۔

● سید نصیر حسین خاں تخلص خیال ابن سید جعفر حسین خاں ۱۸۶۸ء محلہ حاجی گنج عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ علم و ادب کا شوق بچپن سے تھا۔ آنکھ کھلی تو شعر و شاعری کا چرچا پایا۔ ان کے ماموں شاد عظیم آبادی اپنے وقت کے سب سے بڑے غزل گو شاعر تھے۔ لیکن آپ کا رجحان نثر نویسی کی طرف ہوا۔ شروع میں فرضی نام سے مضامین لکھتے تھے۔ بعد میں "ادیب" برابر مضامین لکھتے رہے۔ اردو ادب میں خیال کا مقام بہت ہی بلند ہے۔ وہ صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ ۱۹۳۴ء میں احباب سے ملنے چھپارہ گئے اور وہیں کچھ دنوں علیل رہ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

● مولانا سید سلیمان ندوی ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے علمی، تحقیقی و ادبی خدمات کا اعتراف دنیائے ادب نے خوب خوب کیا ہے۔ یوں تو

آپ کی کئی مشہور کتابیں ہیں۔ لیکن نقوش سلیمان، عرب و ہند کے تعلقات، ارض القرآن اور حیاتِ شبلی خاص طور پر اہمیت کی حامل ہیں۔

● شاد عظیم آبادی نے بھی شاعری کے علاوہ نثر کی متعدد صنفوں پر طبع آزمائی کی ہے۔ شاد کی کہانی شاد کی زبانی، حیات فریاد، صورۃ الخیال، فکر لیغ، بدھاوا، نقشِ پائدار، تاریخ صوبہ بہار، نوائے وطن اور مکتوب شاد وغیرہ آپ کے اہم نثری سرمائے ہیں جو قابل لحاظ ہیں۔

● سید ضیاء الدین احمد مصنف کعبہ ملوکی و ملوکی اور سیرۃ الصیف

● اور اس کے علاوہ مولوی رحیم الدین اڈیٹر اور مالک "لیمپ" پٹنہ، نواب سید محمد آزاد، مولوی عبد الغنی وارثی، میر حصیر، سید افضل الدین مصنف فسانۂ خورشیدی، مولانا سلیمان اشرف، محمد سلطان ابن ولایت علی خاں وغیرہ بھی نثار عظیم آباد میں شامل کئے جاتے ہیں۔

●●

حصّہ اوّل

منظومات

شاہ قائم چشتی نظامی قتیلؔ

سید شاہ محمد قائم چشتی نظامی المتخلص بہ قتیلؔ سجادہ نشین آستانۂ چشتیہ نظامیہ داناپور، ۲۸ جمادی الاول بروز جمعہ ۱۳۱۱ھ کو داناپور ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ موصوف کی علمی لیاقت انگریزی میں آئی۔ اے تک ہے۔ ذوق سخن بچپن ہی سے ہے۔ پہلے صرف قصائد لکھتے تھے۔ تقریباً ۱۹۱۵ء کے بعد ہر صنف کلام کی طرف توجہ دی۔ فارسی شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں لیکن اردو میں جناب مولانا سید امیر حسن بدر آروی جانشین حضرت صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے۔ ہندوستان میں من حیثیت مقرر سیرت پاک کے جلسوں میں طلب کئے جاتے تھے۔ آپ کی مطبوعہ تصانیف اردو اور فارسی درج ذیل ہیں:-

(۱) ساغر کیف دیوان (فارسی) (۲) رباعیات خاص (۳) نور مجسم (۴) مصلح آخرت (۵) ظہور انوار (۶) انتساب الاخبار (۷) اذکار الابرار (۸) خزینۃ الانوار (۹) نور علی نور (۱۰) سید العرب والعجم (۱۱) محاربہ اشتہار ارہ (۱۲) راوی علم غیب (۱۳) مناظرہ میلاد افزا (۱۴) ذبیح عظیم (۱۵) بارہ شہزادے (۱۶) کفر یزید (۱۷) مشکوۃ حقیقت (۱۸) تضمین جمیل بر غیر السبیل (۱۹) مسئلہ مرغوب خرد (۲۰) مسئلہ مرغوب کلاں (۲۱) تاریخ سلف (۲۲) اخوان بدخصال (۲۳) تہتر فرقے (۲۴) تجلیات قتیلؔ (دیوان اردو) (۲۵) گنجینۂ قتیلؔ مع ضیاء العرفی

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

(۲۶) شجراتِ گل افشاں۔ اس کے علاوہ انگریزی کی چند کتابیں ہیں۔ اللہ کے فضل و کرم سے جناب قتیل صاحب بقید حیات ہیں۔ نمونہ کلام میں آپ کی تحریر کردہ "حمد" منسلک ہے۔

حمد

بجا پڑتا ہے دل پر نقش آکر قدِ دلبر کا
قلم ہے دستِ قدرت میں الف اللہ اکبر کا

اساسِ فضلِ بے پایاں، بنائے امن بے غایت
ستونِ قصرِ جنت ہے الف اللہ اکبر کا

بہارِ بے خزاں، حسنِ فضائے عرصۂ جنت
ہے سروِ گلشنِ اسلام الف اللہ اکبر کا

فضائے ذاتِ حق "نام خدا" منصورِ وحدت ہے
کھنچا ہے دار کی صورت الف اللہ اکبر کا

گذر کر گوشِ باطل سے جگر دل ہے جا اس کی
سنانِ روح فرسا ہے الف اللہ اکبر کا

نشانِ منزلِ اول، سراغِ مقصدِ آخر
ہے سنگِ شاہراہِ عشق الف اللہ اکبر کا

حصولِ کنزِ مخفی، فتحِ بابِ کشورِ معنی
کلیدِ قفلِ عرفاں ہے الف اللہ اکبر کا

قیامت ہی قیامت ہے سراپا حشر منظر ہے
شبیہ قدِ جاناں ہے الف اللہ اکبر کا

عبدالمنان بیدلؔ

عبدالمنان، تخلص بیدلؔ، یکم جولائی ۱۸۹۴ء کو پیدا ہوئے۔ موضع ڈیانواں ضلع پٹنہ آپ کا وطنِ مالوف ہے۔ آرہ ضلع اسکول اور پٹنہ کالجیئٹ اسکول سے ابتدائی تعلیم مکمل کر کے پٹنہ کالج میں تعلیم حاصل کی اور پھر ایم۔ اے کلکتہ یونیورسٹی سے ۱۹۱۹ء میں مکمل کیا۔ ۱۹۱۹ء میں ہی فارسی اور عربی کے لیکچرر پٹنہ کالج

میں مقرر ہوئے۔ اس کے بعد پٹنہ کالج میں پروفیسر اور پھر اسی کالج میں شعبہ اردو، فارسی و عربی کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔

اپنی ادبی زندگی میں روشنی اور معاصر کے مدیر کے فرائض بھی انجام دیئے اس کے ما سوا قواعد فارسی، نظم جدید اول اور دوئم، اشعار مومنؔ، اشعار میرؔ، اشعار ذوقؔ، اشعار غالبؔ، اشعار رومیؔ، اشعار خاقانیؔ، اشعار حافظؔ و تفہیم، دولت اور اسلام، خاندان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، جیسی کتابوں کے مؤلف و مصنف ہیں۔ آپ کے کلام کا مجموعہ "نوائے بیدلؔ" منظر عام پر آ کر دادِ تحسین وصول کر چکا ہے۔ بلا شبہ آپ کا ذوقِ شاعری پاکیزہ اور اعلیٰ ہے۔ اصناف سخن میں غزل زیادہ کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں بھی تغزل کا رنگ ملتا ہے۔ جس وقت یہ کتاب ترتیب دی جا رہی تھی، اس وقت آپ حیات تھے۔ مگر افسوس کہ ادھر ۲۰ر اپریل ۱۹۸۲ء کو انتقال فرما گئے۔

نمونۂ کلام یہ ہے:-

سو بے حجابیوں سے سوا یہ حجاب ہے
شوخی لیے ہوئے جو ترا اجتناب ہے

دل کو شباب اک بتِ کافر کا بھا گیا
جس دن کو ڈر رہے تھے ہم آخر وہ آ گیا

انجان تم بنے رہو یہ اور بات ہے
ایسا تو کیا ہے تم کو ہماری خبر نہ ہو

ساقی شراب اپنے لبوں سے لگا کے لا
ہلکی سی کچھ، ورنہ نشہ اس کو بنا کے لا

دے ہم کو چاندنی میں سنہری شراب دے
لا آبِ زر نگار میں چاندی ملا کے لا

ناصح شراب دینے سے روکے اگر تجھے
منہ پھیر کر ہماری طرف مسکرا کے لا

اس چشم مے فروش کا عکس اس میں ڈال دے
اس طرح فیض بادۂ رنگیں بڑھا کے لا

چلو میں اپنے ڈھال کے ساغر سے لا شراب
مقدار میں گھٹائیے اثر میں بڑھا کے لا

زاہد کچھ اور سمجھا ہے ساغر نہ ہے کچھ اور
اک جلوہ اس کا دور سے اس کو دکھا کے لا

کاظم حسین زارؔ

سید کاظم حسین نام، زارؔ تخلص، ابن سید جعفر حسین، مولد و مسکن عظیم آباد پیدائش ۱۸۹۶ء میں ہوئی۔

آپ کی ادبی زندگی کے آغاز کا صحیح دور معلوم نہیں۔ شعر و سخن میں آپ کے اساتذہ جناب نباؔ صاحب، موجؔ اور میر ذکی حسین صاحب ذکیؔ ہیں۔ آپ نے اصنافِ سخن میں غزل، نظم، رباعی، قصیدہ اور مرثیہ وغیرہ پر طبع آزمائی کی۔ لیکن غزل گوئی سے آپ کو زیادہ رغبت رہی ہے۔ علم عروض کے مستند استاد تھے۔ آپ قدیم تہذیب کے آئینہ دار تھے۔ بے جا تصنع اور نمائش نام کو نہ تھی۔ محبت اور خلوص کے پیکر تھے۔ آپ کے کلام اکثر رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ اور ریڈیو سے بھی برابر نشر ہوتے رہے ہیں۔ آپ کے کلام کا مجموعہ بنام "نشاطِ غم" منظرِ عام پر آچکا ہے۔ شعر و سخن میں آپ کے کئی شاگرد بھی ہوئے ہیں، جن میں ہوشؔ عظیم آبادی، قاسمؔ صہبا جیلی، اصغر امام فلسفی اور صابر آروی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ۲۹ جنوری ۱۹۶۳ء کو آپ کی وفات ہوئی۔ نمونۂ کلام میں آپ کی ایک غزل یہ ہے ؎

مرے ساتھ آئے رنگِ بزمِ جاناں کون دیکھے گا
دل و جاں نذر کر کے خونِ ارماں کون دیکھے گا

نہ گھبراؤ کرے گا کون دعویٰ خونِ ناحق کا
سرِ محشر تمھیں سر در گریباں کون دیکھے گا

خدا را درد کا میرے اثر تم بھی نہ لے لینا
یہ ہنس ہنس کر مرا حالِ پریشاں کون دیکھے گا

نظر ڈالو سرِ راہِ تصور عام دعوت ہے
مری آنکھوں ہی سے تصویرِ جاناں کون دیکھے گا

غنیمت ہے شبِ غم نیند اڑ جاتی ہے آنکھوں سے
سحر تک سیکڑوں خوابِ پریشاں کون دیکھے گا

بکھر جائیں گے جلوے تم نقابِ رخ نہ سرکاؤ
نگاہِ شوق کی تنگیِ داماں کون دیکھے گا

قطعہ تاریخ

(سید شاہ محمد قاسم چشتی نظامی قتیلؔ، سجادہ نشین خانقاہ دانا پور، پٹنہ)

ادبستانے، از عظیم آباد — کرد شائع چو حضرت سلطاں
فاضل وقت، صاحب ادراک — ماہر علم و فن گرامی شاں
ہست پابند کلک خود، ہمہ دم — گرچہ آزاد است او، ہمہ آں
آمدہ الا نامہ سیاسی — پس سخن کم میسر زدہ ہمہ داں
بہر تاریخ او نوشت قتیلؔ — ارمغان علی، عظیم الشان

۱۴۰۲ھ — ۱۴۰۲ھ

ولہ

آمدہ سبزہ گل عظیم آباد — از شراب مبین ماضی و حال
ادبستاں نیست، خمکدہ لاریب — ساغر خاص، آمدہ سن و سال

۱۹۸۲ء

(سید غضنفر نواب دانشؔ عظیم آبادی)

زہے، باغِ عظیم آباد دانشؔ — خوشا، ہم بادہ خوارانِ تب و تاب
وہ پیرِ میکدہ بیدلؔ، کہ جو تھا — بقول غالبؔ اک استادِ نایاب
وہ راسخ صاحبِ اسرارِ باطن — کتابِ علم و حکمت اس کا اک باب
وہ دورِ صد نشاط و بہجت افراط — وہ عہدِ عشرت و تہذیب و آداب
ضیا و شاد و نزار و برق و پرویز — پریشان و فغان و موج و بیتاب
خدا کے فضل سے اب بھی بہت ہیں — سپہ شعر و ادب، جام مئے ناب

بجا ہے گر کہے آزاد سالی
دبستانِ عظیم آباد شاداب

۱۲۹
+۱۸۵۳
۱۹۸۲ء

گرفتِ پنجۂ شہبازِ تحسینِ نظر ہے گی — ترے جذبوں کو ہائے صیدِ پرافشاں کون دیکھے گا

کسی نے تجھ پہ جیتے جی نہ جب ذرا اک نظر ڈالی

تو پھر مڑکر سوئے گورِ غریباں کون دیکھے گا

حمید عظیم آبادی

عبدالحمید نام، حمیدؔ تخلص ابن سید یوسف حسین مرحوم، یکم رمضان المبارک ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸ فروری ۱۸۹۶ء کو عظیم آباد کے محلہ لودی کٹرہ میں پیدا ہوئے ۱۹۱۵ء میں میٹرک فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا۔ والد کے انتقال کے باعث کالج کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا لیکن مطالعہ برابر جاری رہا۔ آپ کی تعلیمی لیاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ بی۔ اے (آنرز) اور ایم۔ اے تک کے طلبہ کو فارسی اور اردو پڑھایا کرتے تھے۔

۱۹۱۳ء سے شعر کہنا شروع کیا۔ ابتدا میں تین برسوں تک ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی سے تلمذ رہا۔ ۱۹۱۵ء میں ۲۸ مارچ کو شادؔ عظیم آبادی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوگئے۔ آپ کو شاعری کا شوق فطری تھا۔ یوں تو آپ نے شاعری کی تمام اصناف پر طبع آزمائی کی لیکن انھیں غزل گوئی سے خاص رغبت تھی۔ ان کی غزلوں میں ان تمام روایات کے تغزل کا رچاؤ موجود ہے، جو دلیؔ، دردؔ، آتشؔ اور غالبؔ کے یہاں پایا جاتا ہے۔ لیکن خواجہ میر دردؔ، شادؔ اور آتشؔ کا اثر ان کے یہاں زیادہ نمایاں ہے۔ موصوف کو فن عروض پر کامل دستگاہ حاصل تھی اور اس فن پر آپ نے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں جامع العروض، رمز العروض، مفتاح العروض قابلِ ذکر ہیں۔ حضرت حمیدؔ کے اہم کارناموں میں ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے

اپنے استاد مرحوم شاد عظیم آبادی کے اکثر و بیشتر کلام کو عوام کے سامنے پیش کرنے کی ہر ممکن جدوجہد کی۔ آپ صاحب طرز نثر نگار بھی تھے۔ مختلف مقالوں اور مضامین کے علاوہ کئی کتابیں بھی تصنیف کیں، جن میں "بہار میں اردو" غیر مطبوعہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ ۱۹۵۶ء میں عظیم آباد سے ترکِ وطن کر کے سکھر (پاکستان) چلے گئے۔ جہاں علم و ادب کے چراغ کو فروزاں کرنے میں ہمہ تن کوشاں رہے۔ مجلس ادب سکھر کا قیام آپ ہی کا رہینِ منت ہے۔ علاوہ ازیں ایک سہ ماہی جریدہ "جام جم" بھی آپ کی ادارت میں تشنگانِ ادب کی پیاس بجھاتا رہا۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو کچھ عرصہ کے لئے عظیم آباد آ گئے۔ جہاں سے پھر واپس نہ جا سکے۔ اور ۶ نومبر ۱۹۶۳ء کو اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ نمونۂ کلام میں آپ کی ایک غزل یہ ہے

سوزِ غم یوں برقِ درآغوش ہے دل کے لئے
ہو مسافر جس طرح بیتاب منزل کے لئے

کلکِ قدرت نے ازل ہی سے دیا رنگ دوام
دل بنا غم کے لئے اور غم بنا دل کے لئے

اے خوشا جوشِ جنوں! گلزار دنیا ہو گئی
پاؤں میں زنجیر ڈالی سازِ محفل کے لئے

دیدنی ہیں دستِ قدرت کی عنایت پاشیاں
اتنے سامانِ طرب، اک نقشِ باطل کے لئے

خندۂ گل میں نہاں ہے اشکِ چشمِ کائنات
تازیانہ ہے اس پر رنگِ محفل کے لئے

عقل سودا بن کے چاہے جس کے بھی سر میں رہے
عشق تو پیدا ہوا دانش گہِ دل کے لئے

منزلیں خود چومتی ہیں اس کے مجنوں کے قدم
اور دنیا ہے کہ سرگرداں ہے منزل کے لئے

جلوۂ رنگیں تو پردہ ہے حجابِ ناز کا
لوگ کیوں مجنوں بنے پھرتے ہیں محمل کے لئے

سانس بھی خارِ خلش زا بن کے چبھتی ہے حمید
اک بلائے جاں محبت ہو گئی دل کے لئے

شمس الدین شمسؔ منیری

حافظ شمس الدین احمد نام اور شمسؔ تخلص۔ ۱۸۹۶ء میں پٹنہ کے مشہور قصبہ منیر شریف میں پیدا ہوئے۔ پٹنہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے اور بی۔ ایل کی ڈگریاں حاصل کیں چند سال جے۔ بی۔ بی کالج مظفر پور میں اردو فارسی کے پروفیسر ہوئے پھر راد شا کالج کٹک میں قانون کے پروفیسر رہے۔ ۱۹۲۷ء میں اردو فارسی کے پروفیسر کی حیثیت سے پٹنہ کالج آئے۔ اس کے بعد شعبۂ اردو کے صدر مقرر ہوئے اور اسی عہدہ پر ۱۹۵۱ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

آپ فطری شاعر تھے۔ آپ کا شمار بہار کے ممتاز ترین شاعروں میں ہے نظم اور غزل دونوں صنفوں میں طبع آزمائی کی۔ آپ کی زبان شیریں اور انداز بیان سادہ اور پر زور ہے۔ جذبات انسانی کی ترجمانی اور مناظر قدرت کی تصویر کشی آپ کا طرۂ امتیاز رہا۔ "گل بانگ" آپ کے کلام کا مجموعہ ہے، جو شائع ہو چکا ہے فروری ۱۹۷۵ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ نمونۂ کلام میں آپ کی ایک نظم بعنوان "ارض حجاز" یہ ہے ؎

وہ دلفریبیِ ارضِ حجاز کیا کہئے
ہے ذرہ ذرہ وہاں جاں نواز کیا کہئے

وہ ریگ و سنگ پئے اہلِ ذوق مفتاطیس
وہ دلکشیِ نشیب و فراز کیا کہئے

طلوعِ صبح سے وہ تلبیے، وہ تکبیریں
سکوتِ شب کا وہ راز و نیاز کیا کہئے

جہاں مجاز اک آئینۂ حقیقت ہے
وہاں حقیقتِ رنگِ مجاز کیا کہئے

وہ پائے شوق کی وحشت خرامیاں واللہ
سمٹ گئی رہِ دور و دراز کیا کہئے

وہ باغہائے تمر، اور وہ ہجومِ نخیل
فضائے یثرب دیدہ نواز کیا کہئے

وہ خواب گاہِ نبوت، وہ گنبدِ خضرا — وہ اس کا جلوۂ نزہت طراز کیا کہئے
وہ مسجد نبوی، وہ حریم خاصِ رسول — نماز ادا کرو وہاں کی نماز کیا کہئے
محل کھڑا ہوا گھر سے جو شمس بے سر و پا
کشش یہ کس کی تھی بندہ نواز کیا کہئے

ثاقب عظیم آبادی

مولوی سید حسن رضا نام، ثاقب تخلص خلف منشی سید علی حسن علی مرحوم محلہ شاہ کی املی شہر عظیم آباد میں ۱۸۹۶ء کو پیدا ہوئے۔

موصوف کی تعلیمی لیاقت فاضل (الہ آباد یونیورسٹی) ہے۔ آپ کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۱۲ء سے غزل کی شکل میں ہوا۔ اصناف سخن میں غزل، نظم، حمد، نعت، مرثیہ، سلام، منقبت، رباعی اور سہرا پر طبع آزمائی کی۔ جو ہندوستان کے اکثر و بیشتر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور اس کے علاوہ کئی بار ریڈیو سے بھی کئی کلام نشر ہوئے ہیں۔ شعر و شاعری کے علاوہ نثر میں بھی کئی مضامین لکھے ہیں جو یادگارِ عشق عظیم آباد کی گذشتہ ادبی محفلوں کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئی ہیں۔ آپ کا مطبوعہ دیوان "سرمایۂ نشاط" منظرِ عام پر آچکا ہے۔ موصوف نے کافی دنوں تک پٹنہ کا بجٹ ہائی اسکول کے ہیڈ مولوی کے عہدہ پر فائز رہ کر علمی خدمات انجام دی ہیں۔ آپ کے ادبی شاگردوں کے نام بالترتیب یہ ہیں:- پرویز شاہدی، ہمدم، حیدر، رمز، سعدی، شفا، شکیب ایاز، تاج پیامی اور گہر۔ فنی طور پر آپ کے محبوب شعراء میر اور غالب ہیں۔ آپ کی تاریخ وفات ۱۹ر جنوری ۱۹۷۲ء ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

شب آخر ہو چلی کہرا چھٹا تاروں کو نیند آئی
مسیحا تم نہ آئے اور نہ بیماروں کو نیند آئی

نسیم آئی کبھی گلشن میں گاہے چل گئی صرصر
کبھی پھولوں کو نیند آئی کبھی خاروں کو نیند آئی

ادا تو قاتلانہ تھی مگر حسرت یہ ہے مجھ کو
نہ بسمل نے سکوں پایا نہ تلواروں کو نیند آئی

زبانِ ثاقبِ دلکش نے ایسی داستاں چھیڑی
ادیبوں نے سکوں پایا ہے فنکاروں کو نیند آئی

رباعی

زیبا ہے بتوں کو دل ربا بھی کہہ دیں
دردِ غمِ عشق کی دوا بھی کہہ دیں
یہ سب تو کہیں مگر اس سے بڑھ کر
کچھ اور بھی کیا کہیں خدا بھی کہہ دیں

شاہ غلام حسنین گلؔ

مولانا شاہ غلام حسنین نام، گلؔ و امیدؔ تخلص۔ پھلواری شریف ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۸ء میں کم و بیش ستر سال کی عمر تھی۔ آپ حضرت قبلہ مولانا قاری شاہ سلیمان پھلواروی کے تیسرے صاحبزادے اور آستانہ سلیمانیہ کے سجادہ نشین۔ عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور ہندی کی اعلیٰ استعداد رکھتے تھے۔ صوفیوں کے سلاسلِ طریقت، ان کی تاریخ اور ان کے احوال میں سند تسلیم کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس صنف میں بے شمار مضامین آپ کے شائع ہو چکے ہیں۔ شاعری میں اپنے مکرم حضرت مولانا تمنا عمادی کے شاگرد ہیں۔ آپ پہلے گلؔ تخلص کرتے تھے۔ پھر بعد میں امیدؔ کرنے لگے۔ نمونہ کلام یہ ہے ؎

گھر سے باہر آ رہی ہے تاب روئے یار کی
واہ کیا تقدیر چمکی روزنِ دیوار کی

زرد چہرہ آنکھ پتھرائی زباں اور ہونٹ خشک
اے مسیحا اب یہ حالت ہے ترے بیمار کی

اس کی نظروں میں سمائے پھر نہ ساون کی جھڑی
دیکھ لے بارش جو میری چشم دریا بار کی

ہے تشابہ کا تعلق ان کے دنداں سے اسے
اس لئے ہے قدر اتنی گوہر شہوار کی

چشم دابرد دیکھ کر ان کے تعجب ہے مجھے
کیا ضرورت ہے گل نرگس پہ اک تلوار کی

جس کو دے رکھا ہے خورشید قیامت کا خطاب
ایک چنگاری ہے میری آہِ آتش بار کی

کیا ہنسی آتی ہے اے گل جو نہیں خود اہلِ فن
اہلِ فن سے چاہتے ہیں داد وہ اشعار کی

افضل عظیم آبادی

سید افضل علی خاں نام، افضل تخلص، سکونت محلہ سنگی دالان، عظیم آباد خلف نواب محمد محسن خاں ابن نواب فدا حسین مرحوم اور جناب نواب احمد علیخاں کے حقیقی بھانجے تھے۔ آپ کے مورث اعلیٰ بنارس کے باشندے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد غازی پور آئے اور وہاں سے کچھ لوگ حاجی پور اور کچھ عظیم آباد کے محلہ سنگی دالان میں آکر رہ گئے۔ آپ کی پیدائش کے متعلق جناب غضنفر نواب دانش ۱۸۹۸ء بتاتے ہیں آپ کی علمی لیاقت بی۔ اے تھی۔ آپ آزاد خیال اور صاحبِ مذاقِ سلیم تھے۔

شاعری میں جناب شاد عظیم آبادی سے تلمذ تھا۔ آپ کے بڑے صاحبزادے مہدی علی خاں مہدی مونگیر میں پروفیسر ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

غمخوار نہ ہمدم، نہ کوئی راہ نما ہے
کیوں شامِ غریب الوطنی آہ یہ کیا ہے

آگاہ ہیں لذت سے شہیدانِ محبت
کیا جانیں خضر اس کو جو مرنے میں مزا ہے

اے خونِ جگر اشک، کہ تو اڑ کے نہ پہونچا
سنتا ہوں کہ اس شوخ کے ہاتھوں میں حنا ہے

نشتر سے کبھی کم نہیں دل کو مرے افضل — کہنا وہ بتوں کا کہ کہاں تیرا خدا ہے

ہمیں گردن جھکائے شرم سے خاموش بیٹھے تھے — زیارت کر رہا تھا اک جہاں اس روئے زیبا کی

سماں یہ دیدنی تھا میکدے کا تیرے اے ساقی — وہ پیاری پیاری باتیں جام سے جھک جھک کے مینا کی

نوابزادہ سید محمد مہدی

نوابزادہ پٹنہ کے مشہور و معروف گندری خاندان کے روشن چراغ تھے۔ یہ چراغ دسمبر ۱۸۹۹ء کو روشن ہوا اور ۱۶ جنوری ۱۹۷۲ء کو بجھ گیا۔

اس دور کی روایت تھی کہ مقتدر خاندان کے افراد قومی زندگی میں حصہ لیتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں نوابزادہ بہار کی مجلسِ قانون ساز کے ممبر منتخب ہوئے اور درمیان میں تین برس کا وقفہ چھوڑ کر ۱۹۵۷ء تک برابر مجلسِ قانون ساز کے ممبر رہے۔ ۱۹۴۰ء میں بہار لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بلا مقابلہ منتخب ہوئے اور بعد میں حزبِ مخالف کے لیڈر کے فرائض کانسٹی ٹیوشن کے اجرا تک انجام دیتے رہے۔ آپ کا ادبی ذوق کونسل کی تقاریر سے بھی ظاہر ہے۔ جہاں دورانِ تقریر میں چبھتے ہوئے اشعار تقریر کو مفید کے ساتھ ساتھ دلکش بنا دیتے تھے ۱۹۳۶ء میں آپ پٹنہ میونسپلٹی کے چیرمین منتخب ہوئے۔ آپ کا دورِ چیرمینی اس قدر مقبول ہوا کہ، جو میونسپل کمشنران ابتدا میں آپ کے Static تھے وہ بعد میں آپ کے سب سے بڑے مداح ہو گئے۔ پانچ سال کا دور گذرنے کے بعد اگرچہ آپ میونسپل کمشنری کے لئے کھڑے تک نہ ہوئے۔ پھر بھی کمشنران کی ایک میٹنگ نے آپ سے درخواست کی کہ آپ پھر چیرمینی قبول کر لیں۔ لیکن آپ کا خیال تھا کہ کچھ عہدے ایسے ہیں کہ جنھیں صرف ایک ہی دور میں کرنا چاہیئے۔

اور ان میں چیرمینی کا عہدہ بھی ہے ۔ اس لئے ممبران کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے پھر چیرمینی کرنے سے انکار کردیا۔

آپ نے اپنی ادبی خواہش کی خاطر اصنافِ سخن کی تمام صنفوں مثلاً غزل، رباعی اور قطعہ پر طبع آزمائی کی۔ نمونہ کلام یہ ہے ؎

دل کو مٹا کے دل میں تم اے جان جاں آگئے
گھر کو اجاڑ کر چکے تب میہماں رہے

اے بت شکن مزاج پرستش ہے بت تراش
سجدہ یہ چاہتا ہے کہ اک آستاں رہے

ہے حادثاتِ دہر سے منظور کھیلنا
ہاں ہاں ابھی زمین رہے آسماں رہے

دہرا رہا ہوں نزع میں ماضی کی داستاں
اے موت، نا تمام نہ یہ داستاں رہے

ہستی سے شوق، شوق سے وارفتگیِ شوق
ڈگمگا گیا قدم قدم اولیں کے بعد

کرتا ہوں اپنے کوچہ میں سجدے کہ سجدہ آئیں
ان کا قدم زمیں پہ پڑا اس جبیں کے بعد

اے دردر ہرواں میں چلا روزِ اولیں
اب آرہا ہوں قافلہ آخریں کے بعد

مے پی چمن میں آئے، نگاہیں ملیں، ہنسے
کتنے تغیرات ہوئے ہیں نہیں کے بعد

بدرالدین احمد بدر

سید بدرالدین احمد المتخلص بہ بدؔر خلف بہادر ظہیر الدین احمد مرحوم ۱۹۰۰ء میں اپنے وطن پٹنہ (عظیم آباد) میں پیدا ہوئے اور ہمیشہ یہیں رہے۔ آپ کے والد اپنے وقت کے ایک اہم اور باصلاحیت ادیب (مصنف: کوکبہ ملوکی و مملوکی اور سیرۃ الصیف) تھے۔ بدؔر کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۸-۴۹ء سے ہوتا ہے۔ ویسے کچھ سیاسی مضامین ۱۹۳۷ء سے لے کر ۱۹۴۸ء تک اخباروں

میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۴۸ء سے جب وکالت اور سیاست سے علیحدگی ہوئی تب شعر و شاعری کے میدان میں آئے۔ اصنافِ سخن میں غزل، نظم اور مرثیوں پر طبع آزمائی کی۔ لیکن غزل کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے۔ آپ کے کئی کلام ہندوستان کے بیشتر معیاری رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی نثری اور شعری تخلیقات ریڈیو سے بھی نشر ہو چکی ہیں۔ عظیم آباد کی تہذیبی داستان یعنی "حقیقت بھی اور کہانی بھی" نام کی کتاب آپ نے اٹھارہ سے بیس سال کی مدت میں کافی مشقت کے بعد مکمل کی ہے جو زیرِ طبع ہے۔ دیگر شعرائے کرام کی طرح آپ کے پسندیدہ شعراء میر، غالب، انیس، اقبال اور شاد عظیم آبادی کے علاوہ ہمعصر شعراء میں جمیل مظہری، اجتبیٰ حسین، فیض احمد فیض ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے ؎

جو نظر تیری تجلی کے مقابل ٹھہرے
وہی معیارِ تمیزِ حق و باطل ٹھہرے

ان کا کوچہ نہ سہی کعبہ سہی، دیر سہی
کسی منزل پہ تو آوارۂ منزل ٹھہرے

تم تو آزاد ہو تم کیوں نہ بڑھو چند قدم
ہم تو ہر حال میں پابندِ سلاسل ٹھہرے

جوشِ وحشت میں، جو مجنوں نے اڑایا تھا غبار
وہی مجنوں کے لئے پردۂ محمل ٹھہرے؟

دے کچھ اس طرح دہائی کہ جرس چپ ہو جائے
چادرِ گرد بچھے فاقۂ محمل ٹھہرے

اس میں تخصیصِ کنشتا و حرم دیر نہیں
دل کی منزل تو وہی ہے کہ جہاں دل ٹھہرے

نہ تماشہ، نہ تحیر، نہ تجلی اے بدر
حیف اس آئینہ کی قسمت جو مرا دل ٹھہرے

قطعہ

بیقراری سے ہی بنتا ہے تغیر کا مزاج
کاروانِ وقت کا رک جائے اگر دل ٹھہرے
موسمِ گل بھی ٹھہر جائے چمن میں اے بدر
شرط یہ ہے کہ ذرا قلب عنادل ٹھہرے

مظہر عظیم آبادی

سید مظاہر علی خاں المتخلص بہ مظہر خلف نواب سید محمد محسن خاں مائل، موروثی مکان سنگی دالان عظیم آباد ہے۔ مظہر عظیم آبادی کی پیدائش سنہ ۱۹۰۰ء کو محلہ سنگی دالان میں اپنی نانہال میں ہوئی۔

آپ کو شاعری کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا میں میر عنایت حسین امداد تلمیذِ شاد سے مشورۂ سخن لیا۔ پھر حضرت شاد عظیم آبادی سے اصلاح لیتے رہے۔ حضرت شاد کی وفات کے بعد حضرت حمید عظیم آبادی سے بھی اصلاحیں لیں۔ اصنافِ سخن میں غزل اور سلام پر طبع آزمائی کی۔ لیکن غزل گوئی آپ کو زیادہ مرغوب ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آپ کی شاعری پر شاد عظیم آبادی کا پائدار رنگ نمایاں ہے ادبی خدمات کے تحت بہار اردو اکاڈمی کی جانب سے انھیں ایک بار اسپیشل انعام مل چکا ہے۔ ان دنوں آپ امام باندی بیگم وقف ہاؤس گلزار باغ میں سکونت پذیر ہیں۔ نمونۂ کلام منسلک ہے۔

بڑھ کر جبیں کو چوم لیا شہسوار کی — ہمت پہ آفریں مرے مشتِ غبار کی
کھولی گرہ جو گیسوئے عنبر نثار کی — کالی گھٹا نے بڑھ کے خبر دی بہار کی
کب سے تڑپ رہا ہوں میں دردِ فراق میں — کب سے جلا رہی خلش انتظار کی
روکیں گی کب تلک مجھے پاؤں کی بیڑیاں — رہ رہ کے کھینچتی ہے کشش کوئے یار کی

سوزِ دروں سے پھنکتا ہے دیوانہ آپ کا — جلتا ہے اپنی آگ میں پروانہ آپ کا
کس بے ادب نے چھو لیا پیمانہ آپ کا — ٹوٹی صراحی ہل گیا میخانہ آپ کا
رسوا کہیں نہ ہو — دل دیوانہ آپ کا — مظہر چھلکنے پائے نہ پیمانہ آپ کا
کہہ جو جاتا ہے کوئی بات پتے کی مظہر — عقل منہ دیکھ کے رہ جاتی ہے دیوانے کا

انتساب

اپنی والدہ جنت آشیانی
محترمہ حلیمہ خاتون مرحومہ کے نام
جن کی محبت و شفقت اور دینی تعلیم
نے میری زندگی سنواری

اور

اپنے والد بزرگوار جناب محمد عثمان صاحب
کے نام جن کے سایۂ عاطفت میں تعلیم و
تربیت پائی اور جن کی سرپرستی مجھ کو
آج بھی حاصل ہے۔

سلطان آزاد

شاہ صبیح الحق صبیحؔ

حضرت مولانا سید شاہ صبیح الحق نام، صبیحؔ عمادی تخلص، خلف حضرت مولانا سید شاہ حبیب الحق عمادی مجیبی ۸ ر رمضان المبارک سنہ ۱۳۱۹ھ مطابق سنہ ۱۹۰۱ء کو خانقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سٹی میں پیدا ہوئے۔

آپ کی علمی لیاقت عالم و فاضل (مدرسہ الٰہیات کانپور) ہے۔ موصوف کے ادبی اساتذہ لسان الہند حضرت تمناؔ عمادی تھے۔ آپ کی ادبی زندگی کے آغاز کے متعلق صحیح دور کا پتہ نہیں ہے۔ اصنافِ سخن میں نعت، سلام، منقبت، قطعہ اور غزل پر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن زیادہ لگاؤ غزل سے تھا۔ آپ کی غزلیں زیادہ تر رسالہ ندیم (گیا) اور مشاعروں کے گلدستوں مثلاً تاج وغیرہ میں شائع ہوئی ہیں۔ غزلوں کے علاوہ کچھ مضامین بھی ریڈیو سے نشر ہوئے ہیں۔ شعر و سخن میں آپ کے شاگرد صرف متین عمادی (جو آپ کے نورِ نظر ہیں) ہیں۔ فنی طور پر آپ کے پسندیدہ شعراء فارسی میں، حافظؔ، جامیؔ اور خسروؔ کے علاوہ اردو میں داغؔ، امیرؔ مینائی، تمناؔ عمادی اور شادؔ عظیم آبادی تھے۔ آپ کی وفات ۲۰ رفروری ۱۹۷۵ء مطابق ۸ ارمحرم ۱۳۹۵ھ کو ہوئی۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

خاکساری سے ملا کرتا ہے رتبہ کیسا
پس کے موت کو پہونچ جاتا ہے سرمہ کیسا

ہم غلامانِ محبت اسے کیا جانیں بھلا
دیر کہتے ہیں کسے خانۂ کعبہ کیسا

کس طرح ہو ترے در سے دلِ دیوانہ جدا
شمع سے ہو نہیں سکتا کبھی پروانہ جدا

قیس مشہور ہوا ہم نے لیا ضبط سے کام
اس کا افسانہ جدا ہے مرا افسانہ جدا

مصلحت یہ ہے جو ساقی نے دی ہے کم و بیش
ظرف ہے سب کا الگ سب کا ہے پیمانہ جدا

حیرتی دیکھ کے ہیں اس گلِ خوبی کا جمال
آئینہ خانہ جدا اور پری خانہ جدا

بسملؔ عظیم آبادی

سید شاہ محمد حسن المتخلص بہ بسملؔ عرف شاہ جیبو صاحب خلف سید شاہ علی حسن (بار ایٹ لا) کی پیدائش ۱۹۰۳ء کو خسرو پور میں ہوئی۔

آپ کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۱۵ء سے ہوا شعر و سخن میں شادؔ عظیم آبادی سے صلاح و مشورہ لیا یوں تو آپ نے اصنافِ سخن میں غزل، رباعی اور قطعہ پر بھی طبع آزمائی کی۔ لیکن غزل کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے۔ آپ کے کلام صباح (علی گڈھ) ندیم (گیا)، مدینہ اخبار (بجنور)، رنگ خیال اور ہمایوں (لاہور) کے علاوہ پٹنہ کے اخبار اور رسائل میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ اس کے ماسوا پٹنہ ریڈیو سے بھی کئی کلام اور ایک مضمون "عظیم آباد کی مشہور پتنگ بازی" نشر ہوئے ہیں۔ آپ کی مشہور غزل "سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے" ہندوستان میں ہلچل مچادی تھی۔ یہ غزل رسالہ صباح (علی گڈھ) کے ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئی تھی "حکایت ہستی" آپ کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جو آپ کی وفات کے بعد بہار اردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے شائع ہوا۔ فنی حیثیت سے آپ کے پسندیدہ شعراء میں غالبؔ میرؔ اور شادؔ کا نام آتا ہے۔ آپ اس دنیائے فانی سے ۱۹ جون ۱۹۷۷ء کو کوچ کر گئے۔

نمونۂ کلام یہ ہے ؎

چھڑ گئی رند سے اور شیخ سے توبہ توبہ
سامنا ہو گیا دیوانے کا دیوانے سے

حال میخانہ کا دیکھا بھی نہیں جاتا ہے
اور اٹھا بھی نہیں جاتا ہے میخانے سے

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

قدم قدم پہ تو ہے سامنا قیامت کا
زمانہ پھر بھی قیامت کے انتظار میں ہے

ہم تو بسملؔ ہی رہے خیر ہوئی
عشق میں جان چلی جاتی ہے

وفا عظیم آبادی

سید شاہ خلیل الرحمٰن نام، وفا تخلص، سید شاہ نور الرحمٰن عرف شاہ لال کے خلفِ اصغر ہیں۔ ۱۹۰۲ء میں بمقام کشمیری کوٹھی پٹنہ سٹی پیدا ہوئے۔ علیگڈھ سے بی۔ اے کیا۔ ۱۹۴۶ء میں ترکِ وطن کر کے کراچی چلے گئے۔ شاعری کا اچھا ذوق رکھتے تھے اور کہنہ مشق تھے۔ شاد عظیم آبادی سے تلمذ ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

اب اس کا مقدر ہی جانے جو شخص وطن سے چھوٹ گیا
سر تاج بنے، یا مال رہے، اک پھول چمن سے ٹوٹ گیا
تھی آنکھ کھلی تو یہ دیکھا، اک قافلہ بڑھتا جاتا ہے
کی آنکھ جو بند آیا ہے نظر اک قافلہ مجھ سے چھوٹ گیا
کیا کچھ نہ لکھا، پر کچھ نہ لکھا، اک عمر اسے لکھتا ہی رہا
ہر خط پہ یہی افسوس رہا، یہ چھوٹ گیا وہ چھوٹ گیا
تیغوں کی چمک پر باقی تھی بسمل کی تڑپ ہر مقتل میں
قاتل کی جہاں تلوار رکی بسمل کا وہیں دم ٹوٹ گیا
محفل میں ہوئی درہم برہم کیا ساز بجے کیا راگ چھڑے
جو تار ہے الجھا جاتا ہے، اک تارِ نفس ہو ٹوٹ گیا

بگھٹ عظیم آبادی

غلام دستگیر خاں نام، بگھٹ تخلص، پٹنہ کے محلہ لودی کٹرہ میں ۱۹۰۳ء

کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۲ء میں پٹنہ سٹی اسکول میں داخل ہوئے اور ۱۹۱۹ء میں میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ [illegible]ء میں چھپرہ ضلع سارن میں کلکٹریٹ میں بحیثیت سرکاری ملازم بحال ہوئے اور مارچ ۱۹۶۱ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ شعر و سخن کے میدان میں مزاح نگاری کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ ۱۹۷۷ء میں انتقال ہوا۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

سمجھ میں کچھ نہیں آتا محبت کس کو کہتے ہیں
نتیجے چھاپتے ہیں جو ہم ریسرچ کرتے ہیں

یہ اک دائرہ ہے جس میں ہے کرنٹ اے سی ڈی سی کا (A-C-D-C)
کبھی بس ہے کسی مد میں کبھی ایسے ست کے ویسے ہیں

رباعی

حصہ جو مرا ابو ریوں کا آٹا ہوتا
کیا خوب چرا چرا کے کھایا ہوتا
انسان بن کر تو مر رہا ہوں بھوکوں
اے کاش میں گودام کا چوہا ہوتا

عطا کاکوی

سید شاہ عطاء الرحمٰن المتخلص بہ عطا ابن سید شاہ غفور الرحمٰن حمدؔ ۶؍ رجب ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء کو اپنے وطن کاکو میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم ایم۔ اے (اردو اور فارسی) تک حاصل کی۔

شعر و سخن کا آغاز طالب العلمی کے زمانہ (۱۹۲۵ء) سے ہوتا ہے۔ انھیں سرزمینِ عظیم آباد کے عظیم شاعر حضرت شادؔ عظیم آبادی کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ اصنافِ سخن میں زیادہ تر غزلیں، اور رباعیاں کہی ہیں۔ نثر میں بھی اپنی خدمات مضامین کی شکل میں پیش کی ہیں۔ جو ہند و پاک کے تمام اہم رسائل میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ ریڈیو سے بھی بے شمار مضامین اور کلام نشر ہو چکے ہیں

اب تک کی آپ کی مطبوعہ تصنیفات حسب ذیل ہیں: جمالِ غزل، کمالِ غزل، گلہائے رنگا رنگ، نظرِ غالب، کاروانِ خیال اور ساقی نامہ۔ نثر میں مطالعہ حسرت، مطالعہ شاد، تنقیدی مطالعے، تحقیقی مطالعے، تقابلی مطالعے، حیرت زار، اردو شعرا کے تذکرے (چار جلدوں میں) اس کے علاوہ فارسی کے دو تذکرے سفینۂ خوشگو اور سفینۂ ہندی۔ آپ کی بے پناہ ادبی خدمات کے صلے میں صدر ہند نے سند اعزازی بخشی اور مبلغ پانچ ہزار روپیہ سالانہ تادمِ حیات دینے کا حکم جاری کیا اس کے علاوہ بہار اور یوپی اردو اکاڈمیوں نے بھی کتابوں پر انعاموں سے نوازا ہے۔ شعر و سخن میں آپ کے پسندیدہ شعرا کرام جن سے اثر قبول کیا ہے ان میں آتش، غالب اور شاد ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

ترے حسن نے دیا خود تجھے ذوقِ خود پسندی
یہ ہے اور بات مجرم ہے مری نیازمندی
میں وہ راہ رو کہ کعبہ بھی ہے سنگِ میل جس کو
کہیں گم نہ کر دے اپنی یہی انتہا پسندی
جہاں برق کوندتی ہے وہیں آشیاں بنایا
یہ مرے جنوں کی ہمت یہ مری خطر پسندی
یہ گلوں میں بیل بوٹے، یہ فلک پہ چاند تارے
یہ ترا کمالِ صنعت یہ کمالِ نقش بندی
یہ جنوں کی تھی کرامت کہ ملا سوادِ منزل
مرے کام کچھ بھی آئی نہ خودی کی ہوشمندی
مرے سادہ شعروں میں بھی ہیں عطا فراز معنی
انھیں پستیوں میں ڈھونڈ مرے فکر کی بلندی

مخزن عظیم آبادی

محمد مخزن الحسنات نام، مخزن تخلص، سکونت محلہ مدرسہ عظیم آباد خلف شام معدن البرکات صاحب معدن۔

بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ آغاز میں مولوی رحیم بخش صاحب رحیم مصنف اغلاط، صغیر بلگرامی کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ جب ان کا انتقال ہو گیا تو شاد کی طرف رجوع کیا۔ نیک نفس، بے عذر ملنسار واقع ہوئے تھے۔ کلام میں نمک، روانی اور لطف زبان کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹۲۶ء میں ان کی عمر کیس ۲۱ سال تھی۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

آپ کا روزِ ازل جلوہ نما ہو جانا — سر سے لے پاؤں تلک شرم و حیا ہو جانا
دیکھ اے خونِ جگر بات نہ جائے اپنی — اس ہتھیلی پہ ٹپکنا تو حنا ہو جانا
بے سبب پھیر نہ للہ نگاہیں اے دوست — مار ڈالے گا مجھے تیرا خفا ہو جانا
موسمِ گل کی جنوں خیز ہوا میں کھا کر — دل کے سوکھے ہوئے زخموں کا ہرا ہو جانا
نام ہے عشق میں مٹنا بہ خدا اے مخزن — آبرو ہے رہِ الفت میں فنا ہو جانا

جمیل مظہری

سید کاظم علی مظہری المتخلص بہ جمیل، خلف مولوی خورشید حسین ۱۹۰۵ء کو مغل پورہ پٹنہ سٹی میں پیدا ہوئے، لیکن سارن آپ کا وطن ہے۔ اسکول کی تعلیم مظفرپور اور موتیہاری میں حاصل کی۔ ۱۹۳۱ء میں ایم۔ اے کیا۔ شاعری میں وحشت

کلکتوی سے تلمذ حاصل رہا۔ ۱۹۳۵ء میں پٹنہ میں پبلسٹی آفیسر بنے۔ لیکن ۱۹۴۲ء کی تحریک سے متاثر ہو کر استعفیٰ دے دیا اور جیل بھی گئے۔ جیل سے رہائی پا کر جوشؔ ملیح آبادی کی وساطت سے فلمی دنیا میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۴۶ء میں محکمۂ نشر و اشاعت کے ڈپٹی ڈائرکٹر اور ۱۹۵۰ء میں پٹنہ کالج کے شعبۂ اردو میں پروفیسر بھی ہوئے۔

اصنافِ سخن میں غزل، نظم، مرثیہ، قصیدہ، رباعی اور مثنوی پر طبع آزمائی کی آپ ہر صنفِ سخن پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ بلاشبہہ آپ فطری شاعر تھے۔ آپ کی زبان صاف، سیدھی، عام فہم اور اندازِ بیان میں سلاست، روانی، شگفتگی اور دلکشی تھی۔ وہ حقیقت میں ایک خوش فکر شاعر تھے۔ ان کے خیالات میں پختگی و متانت، جذبات میں صداقت، احساس میں شدت، تجربات میں وسعت و ہمہ گیری اور لب و لہجہ شاعرانہ و عاشقانہ تھا۔ ان کے یہاں داخلیت و خارجیت میں ہم آہنگی، طنزیات میں دلکشی و سنجیدگی، افکار و خیالات میں رنگینی اور گہرائی اور طرزِ بیان میں ترنم و موسیقیت پائی جاتی ہے۔ آپ ترقی پسند شاعر تھے۔ لیکن ان کی شاعری حدودِ فن کے دائرے میں سانس لیتی تھی۔ آپ کی مطبوعہ تصنیفات میں نقشِ جمیلؔ (نظموں کا مجموعہ)، فکرِ جمیلؔ (غزلوں کا مجموعہ)، عرفانِ جمیلؔ، وجدانِ جمیلؔ (رباعی اور قصائد کا مجموعہ) اور آب و سراب (مثنوی) منظرِ عام پر آ کر خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں۔ وہ صرف اعلیٰ درجہ کے شاعر ہی نہیں بلکہ بلند مرتبہ کے ادیب بھی تھے۔ چنانچہ ان کا ناولٹ "فرض کی قربان گاہ پر" اس کی بہترین مثال ہے۔

افسوس کہ اردو ادب کا یہ قیمتی ہیرا ۲۳ جولائی ۱۹۸۰ء کو ہمیشہ کے لئے نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ نمونہ کلام یہ ہے ؎

بقدرِ پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ قریب پہم تو دم نکل جائے آدمی کا

بس ایک احساسِ نارسائی، نہ جوش اسمیں نہ ہوش اسکو
جنوں پہ حالت ربودگی کی، خرد پہ عالم غنودگی کا
ہے روح تاریکیوں میں حیراں، بجھا ہوا ہے چراغ منزل
کہیں سرِ راہ یہ مسافر، پٹک نہ دے بوجھ زندگی کا
خدا کی رحمت پہ بھول بیٹھوں، یہی نہ معنی ہیں اس کے واعظ
وہ ابر کا منتظر کھڑا ہو، مکان جلتا ہو جب کسی کا

ہستی ہے جدائی سے اس کی، جب وصل ہوا تو کچھ بھی نہیں
دریا میں نہ تھا تو قطرہ تھا، دریا میں ملا تو کچھ بھی نہیں
اک شمع جلی تو محفل میں ہر سمت اجالا پھیل گیا
قانون یہی ہے فطرت کا پروانہ جلا تو کچھ بھی نہیں
سیلاب میں تنکے رقصاں تھے، موجوں سے سفینے لرزاں تھے
اک دریا تھا تشو طوفاں تھے، دریا نہ رہا تو کچھ بھی نہیں

عبدالمجید شمس عظیم آبادی

ڈاکٹر سید عبدالمجید المتخلص بہ شمس ابن سید اظہر حسین مرحوم، ۲۰ جنوری ۱۹۰۵ء کو موضع شاہو بیگہ ضلع گیا میں پیدا ہوئے۔ آپ کی علمی لیاقت ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) ہے۔ اپنی پیشہ ورانہ مشغولیات کے تحت پٹنہ کالج میں صدر جغرافیہ، کامرس کالج پٹنہ میں پرنسپل، اپالیچین یونیورسٹی امریکہ میں وزیٹنگ پروفیسر جغرافیہ اور اس کے علاوہ یونیورسٹی آف کنٹکی (امریکہ) سے بھی منسلک رہ چکے ہیں۔

موصوف کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۰ء میں دورانِ تعلیم سے ہوا۔ اصنافِ سخن میں علامہ فضلِ حق آزاد کے حلقۂ تلمذ سے منسلک رہے ہیں۔ اور اسی مدرسۂ فن سے ان کا ذوقِ شعری تربیت پاکر پختہ ہوتا گیا۔ اور متغزلانہ رنگینی میں ہی ایک متفکرانہ سنگینی پیدا ہوتی گئی۔ ان کی غزلوں کا عام انداز کلاسیکل ہے۔ بلاشبہہ آپ نے اپنی شاعری میں جغرافیہ اور شاعری دونوں کا حق ادا کر دیا ہے۔ اور سائنٹفک مباحث کو دلکش شاعری میں پیش کر کے دونوں سے دلچسپی لینے پر قارئین کو مجبور کیا۔ شاعری کی ہر صنف میں دستگاہ رکھتے ہیں۔ غزل، رباعی، قطعہ، نظم وغیرہ ہر منزل کے شہسوار ہیں۔ ان کی ساری عمر شعر و سخن کے بحر بے کنار کی شناوری میں گذری ہے۔ موصوف کی غزلیں معاصر (پٹنہ) اور آجکل (دہلی) میں شائع ہوتی ہیں۔ اور اس کے علاوہ آپ کا کلام پٹنہ ریڈیو اسٹیشن سے بھی نشر ہوتا رہا ہے۔ آپ کی مطبوعہ تصنیفات حیات و کائنات (مثنوی۔ ۱۹۵۶ء) جلوۂ صد رنگ (مثنوی۔ ۱۹۷۰ء) بزم و رزم فطرت (مجموعۂ کلام۔ ۱۹۷۹ء) اور یادِ وطن (مثنوی۔ ۱۹۸۰ء) کے علاوہ "دنیا" جغرافیہ کی کتاب (اردو اور ہندی) اور کمرشیل جغرافیہ (اردو، ہندی) ہیں۔ آپ کے پسندیدہ شعراء میر، غالب، اقبال اور داغ ہیں۔ ان دنوں شہر پٹنہ کے محلہ خان مزا میں مستقل طور سے سکونت پذیر ہیں۔ نمونۂ کلام حاضر ہے ؎

سب کو اپنا شمار کرنا سیکھو　　دشمنی پہ بھی اعتبار کرنا سیکھو
ہے تم کو گلوں سے دل لگانے کا جوش　　دل جوئی نوک خار کرنا سیکھو

دنیا میں ہے غم تو شادمانی بھی ہے　　محرومی ہے گر تو کامرانی بھی ہے
رک جائے قدم نہ رہ نوردِ ہستی　　صحرا میں سراب ہے تو پانی بھی ہے

اک نگاہِ غلط انداز کی بھیک　　اور کیا آپ سے مانگے مرا دل
ذرا علاجِ دلِ ناصبور ہو جائے　　اک ایسی ٹھیس لگا دے کہ چور ہو جائے

تم نے جن شمعوں کو بجھایا ہے — آسماں ان سے جگمگایا ہے
رات بھر ہجر میں گماں یہ رہا — سامنے میرے کوئی آیا ہے

بشن نرائن لال ماتھر رنگین

بابو بشن نرائن لال ماتھر نام، رنگین تخلص، ابن بابو ہر نرائن لال ماتھر آنجہانی ساکن تارنی پرساد لین، شہر عظیم آباد میں ۱۹۰۶ء کو پیدا ہوئے۔

اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں کافی تعلیم حاصل کی۔ شعر گوئی کا شوق فطری تھا۔ سنِ شعور سے آخر تک مشقِ سخن جاری رکھی۔ اکثر مشاعروں میں بھی آپ کا کلام بہت مقبول ہوا۔ محمڈن اسکول پٹنہ سٹی میں تعلیم حاصل کی اور وہیں معاون معلم کے فرائض بہت دن تک انجام دیتے رہے اور وہیں سے ریٹائر بھی ہوئے۔ ان کے اسکول کے قریب ترین دوست اور کلاس فیلو جناب کلیم الدین احمد صاحب ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ نمونۂ کلام پیش ہے:۔

رنگیں شفق سے جیب ہوا جوئبار کا — "دامن لٹک رہا ہے عروسِ بہار کا"
شہرہ ہے آمد آمدِ فصلِ بہار کا — ہر نخل منتظر ہے نئے برگ و بار کا
آئی بہار چار طرف آگ سی لگی — ہر لالہ زار آئینہ ہے شعلہ زار کا
ہے دامِ صد امید میں بلبل کا دل اسیر — آیا ہے گلستاں میں زمانہ بہار کا
محفل میں فیضِ ساقیِ عادل کا عام ہے — پیمانہ بے شراب ہے کس بادہ خوار کا
سارے جہاں میں آپ جو مشہور آج ہیں — احساں کہیں نہ ہو یہ اسی خاکسار کا
دنیائے رنگ و بو میں بسر زندگی ہوئی — میں آشنا ہوں رازِ خزاں و بہار کا
شاخِ مراد جس کی نہ پھولے پھلے کبھی — وہ نخلِ غم ہوں میں چمنِ روزگار کا

مشعلِ فردا دبستانِ عظیم آباد

(حضرت جناب رمز عظیم آبادی)

یہ عظیم الشان کا شہرِ عظیم آباد ہے
آج بھی لوگوں کو موزونیت کا زمانہ یاد ہے

کتنا مردم خیز ہے یہ خطۂ ارضِ بہار
اس کے دامن میں ہیں غلطاں کتنے دُرِ شاہوار

راسخ و جوششؔ، خیالؔ و شادؔ کی محفل ہے یہ
دانش و پرویز و ثاقبؔ کا دھڑکتا دل ہے یہ

گامزن ہے آج بھی علم و ادب کا کارواں
جن کے نقشِ پا سے ہر جادہ ہے مثلِ کہکشاں

آج بھی موجود ہے سلطانؔ سا روشن خیال
اپنے فنکاروں کی گمنامی کا تھا جس کو ملال

خدمتِ اردو کا اپنے ہاتھ میں پرچم لیا
لاکھ دشواری سہی منزل پہ لیکن دم لیا

ہر قدم پر خنکئ بے مہرئ احباب تھی
اس سفر میں دوستی کی ہر ادا نایاب تھی

روکتا تھا راستہ جب موسمِ ہمت شکن
اور بڑھ جاتا تھا کچھ اس کے جنوں کا بانکپن

آفتابِ وقت کی حدت سے یہ جلتا رہا
پھول بھی چنتا رہا کانٹوں پہ بھی چلتا رہا

رات دن جو وردِ لب تھا وہ وظیفہ دیدیا
ہاتھ میں اہلِ نظر کے اک صحیفہ دیدیا

وہ صحیفہ جس میں آیاتِ تمنا ہے رقم
یعنی ہر الفاظ شائستہ بلاغت کی قسم

یہ وہ کوزہ ہے کہ جس کوزے میں دریا بند ہے
سینۂ ذرات میں اور اک صحرا بند ہے

عکسِ ماضی ہے یہ مستقبل کا آئینہ بھی ہے
تشنہ کاموں کے لئے بادہ بھی ہے مینا بھی ہے

جادۂ فن میں بزرگوں کے سفر کا ذکر ہے
موتیوں کی بات ہے لعل و گہر کا ذکر ہے

شمعِ ایوانِ ادب یہ کوششِ آزاد ہے
مشعلِ فردا "دبستانِ عظیم آباد" ہے

کانٹے جو پاسباں ہیں تو گل مطمئن نہیں — گلچیں کے دل میں خوف نہیں نوکِ خار کا
اس گل کو فکر کیا مرے حالِ خراب کی — دن رات جو ہے مست خود اپنی بہار کا
اے نازنیں جو آٹھ پہر مستِ ناز ہے — کچھ حالِ غم بھی سن دلِ حسرت شعار کا
دن کو سکوں نصیب نہ شب کو نصیب چین — رنگینیٔ زمانہ نہ پوچھ حال، دلِ سوگوار کا

شرف عظیم آبادی

سید شاہ شرف الدین احمد نام، شرفؔ تخلص خلف سید شاہ محمد مہدی متوطن محلہ شاہ کی املی شہر عظیم آباد۔ ۱۵ جون ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے آپ کی ابتدائی تعلیم سہسرام ہائی اسکول اور محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ سٹی میں ہوئی۔ انٹرمیڈیٹ کالج پٹنہ سے، بی۔ اے مسلم یونیورسٹی علیگڈھ سے اور ایم۔ اے پٹنہ یونیورسٹی سے کیا۔ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۱ء تک بہار اسمبلی سے آپ کا تعلق رہا۔ پھر حکومت ہند کے سپلائی محکمہ میں آپ کا تبادلہ ہو گیا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے۔ اور پاکستان ہائی کمیشن لندن میں پانچ سال تک اسسٹنٹ ڈائریکٹر (سپلائی) رہے۔ لندن سے واپس آکر ۳۱ دسمبر ۱۹۶۶ء میں اپنی خدمت سے سبکدوش ہو گئے۔

چونکہ گھر کا ماحول علمی اور ادبی تھا، اس لئے بچپن سے ہی لکھنے کا شوق رہا طالب العلمی اور ابتدائی ملازمت تک ہند و پاک کے مشہور رسائل مثلاً علی گڈھ میگزین، نیرنگ خیال، رومان لاہور، تہذیب النسواں لاہور اور عصمت دہلی میں آپ کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ آپ کو شاعری ورثہ میں ملی ہے۔ جوانی میں کافی غزلیں کہی ہیں لیکن وہ مخصوص احباب تک محدود ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے ؎

دل کو آمادہ بہ پیکاں دم بدم کیوں کر کریں — انکی خاطر اتنے ساماں ہم بہم کیوں کر کریں
اپنی آہیں عرش کو گرچہ ہلا دیں گی مگر — کوئی سنتا بھی تو ہو اظہار غم کیوں کر کریں
ہم پہ فرمائش ہے ضبطِ نالۂ دلگیر کی — آپ اتنا تو بتا دیں کم سے کم کیوں کر کریں
اپنی رسوائی کے باعث آپ ہوتے ہوں تو ہوں — راز اپنی زندگی کا فاش ہم کیوں کر کریں
اپنی خودداری بھی تو اک چیز ہے آخر شرفؔ — ان کی ہر خواہش کے آگے سر کو خم کیوں کر کریں

محمود علیخاں صباؔ

سید محمود علی خاں المتخلص بہ صباؔ خلف نواب سید احمد علی خاں مرحوم موروثی مکان سنگی دالان پٹنہ سٹی۔ آپ کی پیدائش شہر عظیم آباد میں ۲۳ اگست ۱۹۰۷ء مطابق ۱۳ رجب ۱۳۲۵ھ بروز جمعہ ہوئی۔ موصوف کی علمی لیاقت بی۔اے ہے۔

آپ کی ادبی زندگی کا آغاز صحیح معنوں میں ۱۹۲۲ء سے ہوا، جب میٹرک کے طالب علم تھے ۱۹۲۴ء میں آپ نے کالج میں بزمِ ادب کی بنیاد ڈالی اور مشاعرہ منعقد کیا جس میں شادؔ، آزادؔ، تمناؔ اور دیگر اساتذہ شریک ہوئے تھے۔ جس کا گلدستہ بھی شائع ہوا تھا۔ شعر و سخن میں اپنے خالہ زاد بھائی سید عبدالحمید المتخلص بہ حمید عظیم آبادی جانشین مسند شادؔ سے ابتدا میں صلاح و مشورہ لیا۔ پھر باضابطہ طور پر شادؔ کے آخری دور کے شاگردوں کی صف میں شامل ہوئے۔ آپ نے اصنافِ سخن میں غزل کے علاوہ رباعی، قطعہ اور نظم پر بھی طبع آزمائی کی۔ لیکن اپنے کو بنیادی طور پر غزلوں کا شاعر کہلانا پسند کرتے ہیں۔ شعر و شاعری کے علاوہ کئی ادبی مضامین بھی لکھے ہیں، جو بہار کے مختلف رسائل

اور اخبارات میں شائع ہوئے ہیں۔ کچھ مضامین تحقیقی بھی لکھے ہیں جو رسالہ معاصر (پٹنہ) میں شائع ہوئے ہیں۔ موجِ صبا، یارانِ میکدہ، بادۂ عرفان، سروشِ میکدہ، بادۂ گل رنگ اور ریاض الالسناب، موصوف کی مطبوعہ تصنیفات ہیں۔ ادبی خدمات اور دلچسپیوں کے علاوہ مختلف سماجی اور سیاسی اداروں سے بھی منسلک رہ چکے ہیں۔ اپنی خدمات کے تحت بہار اردو اکاڈمی سے مالی انعام کی شکل میں ایک ہزار اور اٹھائیس سو روپے پا چکے ہیں۔ آپ کے پسندیدہ شعرا اور ادبا بالترتیب ہیں:۔ میر، غالب، شاد، جگر، فانی، نصیر حسین خیال، خواجہ حسن نظامی وغیرہ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

دیں پر جا کے ٹھہرا اہلِ دل کا کارواں پہلے
محبت نے کسی کی لی تھی انگڑائی جہاں پہلے

نیا انداز تھا اس شامِ غم کی دلفریبی کا
ہوئی تھی آشنا نالوں سے جب اپنی زباں پہلے

انھیں کے سر رہا سہرا مری بربادیٔ دل کا
جو نالے خانۂ غم میں ہوئے پل کر جواں پہلے

وہی تنکا کہ جس پر تھی بنا میرے نشیمن کی
بنایا برق نے اس کو چراغِ آشیاں پہلے

صبا یکساں ہیں میرے واسطے گل ہو کہ کانٹوں
محبت نے پڑھائی تھی مجھے اپنی زباں پہلے

فلسفی عظیم آبادی

اصغر امام نام، فلسفی تخلص ابنِ حضرت مولانا حکیم عبدالرحمٰن حسن امام عارفؔ کی پیدائش ۲۶ ستمبر ۱۹۰۸ء کو شہر عظیم آباد کے محلہ حضرت باعثؔ عالم گنج میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد درسِ نظامیہ مکمل پٹنہ و دہلی سے اور فاضل اورینٹل کالج فتحپوری دہلی (پنجاب یونیورسٹی) سے مکمل کیا۔

شعر کہنے کا ذوق بچپن سے ہی تھا۔ اپنے کلام پر اپنے والدِ ماجد کے علاوہ

سید جلال الدین حیدر دہلوی اور سید کاظم حسین زار عظیم آبادی سے اصلاح لیں۔ چوں کہ فلسفی کی فلسفیت نے سیاسی ہنگاموں کی آغوش میں پرورش پائی ہے۔ اس لئے ان کی نظموں کے علاوہ ان کی غزلوں میں بھی سیاسی چھینٹیں نمایاں ہیں۔ آپ شاعر، صحافی (ان دنوں ہفتہ وار نقیب پھلواری شریف پٹنہ کے ایڈیٹر ہیں) مولانا اور رہنما کے علاوہ انسان دوست ہیں۔ آپ کے کلام اور ادبی و سیاسی مضامین ہندوستان کے اکثر و بیشتر معیاری رسالوں اور جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے ماسوا ریڈیو پٹنہ سے بھی کئی بار آپ کے کلام و مضامین نشر ہوتے رہے ہیں۔

منثورات میں "ایثار" (ڈرامہ) اور "ہماری درگت" (فساد کے موضوع پر) کے علاوہ منظومات میں "افکارِ فلسفی" (سنہ ۱۹۵۶ء) اور "گلزارِ فلسفی" (سنہ ۱۹۸۰ء) آپ کی مطبوعہ تصنیفات ہیں۔ جو منظرِ عام پر آکر دادِ تحسین وصول کر چکی ہیں۔ آجکل پٹنہ میں اپنی قیامگاہ پر رہتے ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

بیاں حسن کی کیا عظمت کسی سے — جو دکھلاتا نہیں صورت کسی سے
لئے پھرتا ہوں جو تصویر دل میں — نہیں ملتی ہے وہ صورت کسی سے
تمہارا حسنِ انور سامنے ہے — نہیں کم ہے مری حیرت کسی سے
میں ہوں پابندِ آئینِ محبت — مرے دل میں نہیں نفرت کسی سے
چشمِ ساقی کی بدولت رہتے ہیں مخمور سے — اپنی مستی ہے مبرا بادۂ انگور سے

رعنا عظیم آبادی

سید حسین احمد نام، رعنا تخلص۔ صدر گلی پٹنہ سٹی کے رہنے والے

اور ایڈوکیٹ تھے۔ دسمبر ۱۹۰۸ء مطابق ۱۳۲۶ھ میں پیدا ہوئے۔ شاعری کا اچھا ذوق تھا۔ کسی سے اصلاح نہیں لی۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

نہ سمجھ میں آئے لیکن یہ خطا نہیں بیاں کی
وہ قفس کی کیسے ہوتی جو زباں تھی آشیاں کی
جو نکل کے دل سے لب تک بھی بہ مشکل آسکی تھی
ہوئی عرش تک رسائی اسی آہِ ناتواں کی
میں چمن سے دور رہ کے کوئی غیر ہو گیا ہوں
کہ چھپائے مجھ سے باتیں کوئی میرے آشیاں کی
ہوئی سارے قافلوں کی وہی رہنمائے منزل
جو فضا میں گرد باقی تھی ہمارے کارواں کی
اسے یاد کیسے رہتی رہ و رسمِ باریابی
جسے ہوش نہ ہو سر کا نہ خبر ہو آستاں کی

شمس نوری

سید شمس الہدیٰ نام، شمس تخلص ابن سید نور الہدیٰ نور، کی پیدائش ۲۵ فروری ۱۹۰۹ء کو پٹنہ سٹی کے مشہور رئیس شاہ کمال صاحب کے مکان میں ہوئی۔ ۱۹۶۲ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے بی۔ ایس۔ سی کی سند حاصل کی۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۵۰ء تک مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں اسسٹنٹ ٹیچر کی حیثیت سے خدمت انجام دی۔ جہاں کچھ غیر اسلامی رسم انجام دیئے جانے پر نزاعی صورت پیدا ہو جانے سے ملازمت ترک کر کے کراچی چلے

گئے۔ اور کراچی یونیورسٹی میں ملازم ہوئے۔ پھر ایس۔ ایم کالج میں ڈیمانسٹریٹر اور لکچرر ہوئے۔ ۱۹۶۳ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایم۔ ایس۔ سی کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔

آپ کو ابتدا ہی سے شاعری سے دلچسپی تھی۔ شروع میں سید عطا کریم عطاؔ سے اصلاح لی پھر کسی سے مشورۂ سخن نہیں لیا۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

دشتِ دہشت کا کرم کیوں ہے گریبانوں پر
اس کے مذہب میں نہیں ظلم یہ مہمانوں پر

وہ نظر آئے اگر طرزِ عبادت کیا ہو
دیکھا شاید ہو نشاں طور کے دامانوں پر

کس گنہگار کی توبہ کا کرشمہ ہے یہ
برق گرتی ہی چلی جاتی ہے بتخانوں پر

چشمِ مخمور ہے اے حسن! مقامِ افسوس
صید گرتے ہیں یہاں شوق سے پیمانوں پر

دیکھ لیتا ہوں قفس میں بھی چمن کا ساماں
بجلیاں کوند گئیں جب کبھی کاشانوں پر

اس تغافل سے ترے آج ہے جینا مشکل
کس کو معلوم! نظر کب ہو پریشانوں پر

رامیشور پرساد گلوارا

بابو رامیشور پرساد گلوارا (ایڈوکیٹ) ڈپٹی میئر و مجسٹریٹ (فرسٹ کلاس) شری بشوناتھ پرساد عرف بتو بابو آنجہانی کے صاحبزادے تھے۔ پیدائش جدی مکان گلوارا ہاؤس واقع محلہ مچھر ہٹہ پٹنہ سٹی میں ۱۲ مارچ ۱۹۰۹ء کو ہوئی۔ ۱۹۲۴ء میں محمڈن اسکول پٹنہ سٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد بی۔ اے اور وکالت کی ڈگریاں بھی حاصل کیں۔ اور ۱۹۳۱ء میں پٹنہ ڈسٹرکٹ بار میں وکالت شروع کی۔

اردو زبان اور شاعری سے خاص شغف رکھتے تھے۔ حضرت زارؔ عظیم آبادی

سے اصلاحِ سخن لی۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

تم رنگ دیکھنا دلِ دیوانہ وار کا
بس منتظر ہوں آمد فصلِ بہار کا

مجھ سے قفس نصیب کو کیا کام اے ندیم
موسم خزاں کا ہو کہ زمانہ بہار کا

جلتے ہیں اور بجھتے ہیں امید کے دیئے
یہ واقعہ ہے میری شبِ انتظار کا

عجلت یہ ہے کہ پشت ہوا پر سوار ہے
کس کی تلاش میں ہے مسافر غبار کا

مجھ سے گدا کے واسطے دامن بچھا دیا
احسان ہے یہ سایۂ دیوارِ یار کا

اس سے بدر جہا تھی غنیمت خزاں کی فصل
جیسا گذر رہا ہے زمانہ بہار کا

گلوار اگر کوئی لاکھ جفائیں کیا کرے
دامن چھٹے نہ ہاتھ سے صبر و قرار کا

بیخود عظیم آبادی

سید شہاب الدین احمد نام، بیخود تخلص ابن جناب سید شاہ حبیب الدین احمد لودی کٹرہ پٹنہ سٹی میں ۱۹۰۹ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۷ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول پٹنہ سٹی سے میٹرک پاس کیا۔ اور ۱۹۳۱ء میں بی۔ اے کے امتحان میں کامیاب ہوئے اس کے بعد عربی سے ایم۔ اے کے امتحان کی تیاری کرنے لگے۔ اور قانون پڑھنے کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ نہایت ذکی اور طبیعت دار، بے انتہا خلیق اور نیک مزاج واقع ہوئے۔ مزاج میں بیحد متانت و سنجیدگی تھی۔

۱۲ اگست ۱۹۲۳ء کو موصوف نے اپنی پہلی غزل حضرت شاد عظیم آبادی کے سامنے اصلاح کے لئے پیش کی۔ طبیعت شناس استاد نے شاگرد کی بہت

تعریف کی اور اصلاح کی۔ جس سے غزل میں چار چاند لگ گئے، مطلع یہ ہے ؎

دھیان آتے ہی الجھتی ہے طبیعت میری زلفِ شبگوں ہے کہ کافر شبِ فرقت میری

آپ کے اشعار میں شاد کے خاص رنگ کی جھلک نمایاں۔ رکیک الفاظ اور سوقیانہ مضامین سے آپ کو احتیاط تھا۔ آپ کا شمار بھی شاد کے ممتاز شاگردوں میں ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

جوشِ وحشت، ہوا پھر سلسلہ جنباں کیسا دھجیاں ہو کے اڑا اپنا گریباں کیسا

پیچ در پیچ ہے وہ گیسوئے پیچاں کیسا مجھ کو زنداں میں نظر آتا ہے زنداں کیسا

وہ چھپائے ہوئے خورشید قیامت نکلا داغِ دل اپنا ہوا آج درخشاں کیسا

پھول بن بن کے مرے خون کے دھبے ابھرے رنگ لایا سرِ محشر مرا داماں کیسا

جلوۂ حسن نظر آتے ہیں کیسے کیسے دل بنا آئینہ دارِ رخِ جاناں کیسا

داغ جتنے تھے ابھر کر بنے گلہائے چمن دامنِ دل بنا تصویرِ گلستاں کیسا

پھر بہار آئی جنوں خیز ہوائیں آئیں
بیخود اب جیب کہاں اور گریباں کیسا

ضمیر پھلواروی

سید شاہ محمد ضمیر الحق نام (عمادی مجیبی) ضمیر تخلص خلف مولانا سید شاہ حسام الحق کی ولادت ۵ ذیقعدہ ۱۳۲۸ھ کو اپنے وطن پھلواری شریف (پٹنہ) میں ہوئی۔ اردو، فارسی اور عربی درسیات کی تکمیل اپنے چچازاد بھائی مولانا تمنا عمادی سے کی۔ انگریزی تعلیم کے لئے کلکتہ گئے۔ وہاں رہ کر انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لئے کسٹم میں نوکری کر لی۔ تقسیم ہند

کے بعد آپ ڈھاکہ چلے گئے۔

شعر گوئی سے دلچسپی آپ کو بچپن سے ہی رہی۔ اس ضمن میں بھی مولانا تمنا عمادی سے ہی تلمذ ہے۔ اردو کی خدمت انجام دینے کے لئے ڈھاکہ میں مولانا تمنا عمادی کے زیرِ صدارت بزم "تلامیذ الرحمٰن" قائم کی۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

اس قدر چمکا جمالِ یار رسوا ہو گیا
ان کا ماہ دہر ہو جانا تماشا ہو گیا

کوئی دیکھے اس سراپا حسن کی رعنائیاں
آئینہ محوِ جمال روئے زیبا ہو گیا

یہ عروج شانِ غم تھا یا کرامت عشق کی
دامنِ دل میں جو آنسو تھا وہ تارا ہو گیا

ہو تمھیں مقصودِ دنیا ہو تمھیں مقصودِ دیں
دین و دنیا سب اس کے جو تمھارا ہو گیا

خیر آئی تو اجل کوئی ملا تو غمگسار
ڈوبتے کو ایک تنکے کا سہارا ہو گیا

اس قدر ہے دلفریبی ہر ادا میں آپ کی
خود مصور دیکھ کر تصویر شیدا ہو گیا

پرویز شاہدی

سید محمد اکرام حسین، اصلی نام "پرویز شاہدی" ادبی نام، ابن سید احمد حسین ضو مرحوم لودی کٹرہ عظیم آباد میں ۲۱ ستمبر ۱۹۱۰ء کو پیدا ہوئے۔ اپنی پیشہ ورانہ مشغولیات کے تحت کافی عرصہ تک، کالکٹہ یونیورسٹی کے ایک کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے معروفِ تعلیم و تدریس رہے۔

آپ کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۲۶ء میں ہوا جس میں مولوی عین الہدیٰ نمر آروی، اور جناب ثاقب عظیم آبادی سے شرف تلمذ حاصل رہا۔ اصناف سخن میں غزل، نظم اور رباعیات پر طبع آزمائی کی۔ لیکن اردو ادب میں شہنشاہِ رباعیات کے

نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی نظموں کے متعلق ناقدوں کی رائے ہے کہ ان کی اہم نظمیں جن کے مطالعہ سے ان کی فنی مہارت، اظہار و بیان کے حسن، زبان کی شستگی اور الفاظ کے در و بست کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے وہ نظمیں ضیافت، استالین، ساز مستقبل، بربطِ دل، فنکار، تضاد، رقصِ حیات، تثلیثِ حیات، اور بے تیرگی وغیرہ ہیں۔ انھوں نے شعر و شاعری کے لئے نثر نگاری بھی کی ہے جو ہند و پاک کے تقریباً سبھی اچھے اور معیاری رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ آپ کے کلام کا ترجمہ ہندوستان کے باہر کی زبانوں میں بھی ہوا ہے۔ آپ کی مطبوعہ تصنیفات رقصِ حیات اور تثلیثِ حیات ہیں۔ آپ کی ذات پر بہار اردو اکادمی کا ترجمان رسالہ "زبان و ادب" کا ایک خاص شمارہ بنام پرویز شاہدی نمبر شائع ہوا ہے۔ آپ کی تاریخ وفات ۵ مئی ۱۹۶۸ء ہے۔ نمونۂ کلام منسلک ہے ؎

ساغرِ سدفائیں کو جام جم بنایا ہے — پھیل کر مرے دل نے "میں" کو ہم بنایا ہے
ہمسفر بنایا ہے ہم قدم بنایا ہے — وقت نے مجھے کتنا محترم بنایا ہے
بت ہزار دل توڑے ہیں کتنے ٹکڑے جوڑے ہیں — زندگی نے جب جا کر اک صنم بنایا ہے
زلف کی طرح اس کو بس سنوارتے رہیئے — زندگی کو فطرت نے خم بہ خم بنایا ہے

میں جہاں کبھی جاتا ہوں پھول کھلنے لگتے ہیں
وقت نے مجھے کتنا خوش قدم بنایا ہے

رباعی

طوفانِ بلا کا ساتھ دیتے دیتے — دم گھٹنے لگا ہے سانس لیتے لیتے
کشتیِ حیات ڈوب بھی جائے نہ کہیں — بازو مرے تھک گئے ہیں کھیتے کھیتے

دیباچہ

ادب کی کسوٹی خود زندگی ہے اور ادب زندگی کا عکاس ہی نہیں نقاد بھی ہے، انفرادی زندگی کا بھی اور اجتماعی زندگی کا بھی۔ ساتھ ہی ادب زندگی اور معاشرے کا خادم ہے۔ یہ ایک متمدن انسان کا عمل ہے جو اپنی زندگی اور ماحول سے غیر منقطع طور پر وابستہ ہے۔

ہر خطے، ہر علاقے، ہر ملک اور ہر دبستان کا ادب اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔ اور یہ پہچان اپنی علاقائی ثقافت، زمینی خوشبو اور نظریاتی احساس کی مرہونِ منت ہے۔

دبستانِ عظیم آباد نے اردو ادب پر گہرے اثرات مرتسم کئے ہیں۔ نتیجے میں قریبی اشیاء اور مظاہر، ادب میں سمٹ آئے ہیں۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے یہاں ان علامات کو ترک کرنے کی شعوری و لاشعوری کوشش نظر آتی ہے جو ایران اور اس کے معاشرتی ماحول سے مستعار تھیں اور جنھیں دوسرے دبستانوں نے کلاسیکی اردو شاعری کے لئے حرزِ جاں بنائے رکھا تھا۔ دبستانِ عظیم آباد کے شاعروں نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھول کر اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی دھرتی کو بغور دیکھا ہے جس پر سال کے بیشتر حصّوں میں تیز سورج چمکتا ہے۔ آندھیاں آتی ہیں۔ دھواں اور غبار چھا جاتا ہے۔ اور پھر اچانک ساون کی برکھا ہر شے پر سبز

جوہر فریادی

سید احمد حسین نام، جوہر تخلص اور فریادی نسبی نسبت سید شاہ الفت حسین فریاد عظیم آبادی ہے۔ آپ کے والد ماجد کا نام سید سجاد حسین مرحوم ہے۔ سالِ ولادت ۱۳۲۹ھ ہے۔ مولد و مسکن محلہ دوندی بازار شہر عظیم آباد ہے آپ کو شاعری کا شوق بچپن سے ہی ہے۔ موصوف کی علمی لیاقت میٹرک منشی فاضل اور ادیب فاضل تک ہے۔ ملازمت کے سلسلے میں حیدر آباد (دکن)، دہلی، لاہور اور کلکتہ میں قیام کیا۔ چند سال تک گورنمنٹ اردو لائبریری بہار میں اچھے عہدہ پر متعین تھے۔ آپ کی تصنیف "سیرتِ رسول اور فلسفۂ اقبال" ادارہ شرعیہ کمالی کمان حیدر آباد (دکن) سے شائع ہو چکی ہے۔ مجموعۂ کلام "نغمہ فریاد" ۱۹۶۸ء تک طبع نہیں ہو سکا تھا۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

وحشت برس رہی ہے گلستاں میں ہر طرف — ہے چاک چاک دامنِ صحرا ترے لئے
یہ سبزۂ لطیف یہ پھیلی ہوئی ہوا — اک گلستاں ہے ساحلِ دریا ترے لئے

بدبخت ہوں جلتے ہوئے ڈرتا ہوں چمن میں — قسمت کہیں ہر پھول کو کانٹا نہ بنا دے
جوہر یہ ستم قطعِ محبت کی ہے تمہید — یہ جوڑ تمھیں اور بھی پیارا نہ بنا دے

سید حسن سرمد

سید حسن نام، سرمد تخلص ابن سید محمد یحییٰ مرحوم، مولد قصبہ شیخپورہ ۲ اپ سکونت سنگھی ہاؤس ترپولیا پٹنہ۔ آپ کی پیدائش یکم جنوری ۱۹۱۱ء کو ہوئی۔ ادبی

زندگی کا آغاز ۱۹۲۳ء سے ہوا۔ اصنافِ سخن میں نزلیں اور نظمیں کہی ہیں۔ اور نثری تخلیقات میں تخلیقی اور تحقیقی مضامین لکھے ہیں۔ آپ کی نگارشات نیا دور، زبان و ادب، معارف اور آوانجیسے اہم اور معیاری رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں سلک کلک، چند تحقیقی مقالے اور بہار کا اردو اسٹیج اور ڈرامہ آپ کی تصنیفات ہیں۔ سلک کلک پر بہار اردو اکاڈمی کی طرف سے ایک ہزار روپے نیز چند تحقیقی مقالے اور بہار کا اردو اسٹیج اور ڈرامہ پر اتر پردیش اردو اکاڈمی کی جانب سے بالترتیب ایک ہزار اور تین ہزار روپے انعام کی شکل میں پا چکے ہیں۔ اس سال یعنی ۱۹۸۳ء میں انھیں غالب ایوارڈ بھی ملا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

یہ زندگی بھی عجب مشغلہ لگے ہے مجھے
امید و بیم کا اک سلسلہ لگے ہے مجھے

ستم میں اس کے کرم کا مزا لگے ہے مجھے
جفا کرے ہے وہ جتنی وفا لگے ہے مجھے

عطا کیا ہے محبت نے درد مند مزاج
کسی کا جرم ہو اپنی خطا لگے ہے مجھے

گلی گلی میں جو چرچا اسی کی ہوتی ہے
یہ دردِ عشق بڑا سانحہ لگے ہے مجھے

نظر کا میری کرشمہ ہے اور کیا کہئے
کہ جس کو دیکھئے وہ آپ سا لگے ہے مجھے

نشانِ منزلِ محبوب کیا ملے مجھ کو
جو راہزن ہے وہی رہنما لگے ہے مجھے

بہاء الدین احمد کلیم

سید بہاء الدین احمد نام، کلیم تخلص، ابن سید ضیاء الدین، وطن نیانواں ہے۔ تاریخِ پیدائش ۱۹۱۱ء ہے۔ آپ کی علمی لیاقت بی۔ اے (آنرس) اور بی۔ ایل ہے۔ ڈسٹرکٹ و سشن جج اور ممبر بہار پبلک سروس

کمیشن پٹنہ کے عہدے پر فائز رہنے کے بعد ان دنوں ریٹائرڈ ہیں۔

اپنی ابتدائی ادبی زندگی میں سنجیدہ اور ظریفانہ کے علاوہ افسانہ لکھتے تھے۔ لیکن بعد میں شعر و شاعری کے میدان میں آئے۔ اصنافِ سخن میں غزل اور نظم زیادہ کہی ہیں۔ جو شگوفہ، معاصر (پٹنہ)، نقوش (لاہور)، آج کل (دہلی) اور زبان و ادب (پٹنہ) جیسے رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے ماسوا ریڈیو سے بھی کئی نثری اور شعری تخلیقات نشر ہوتی رہی ہیں۔ آپ کی مطبوعہ تصنیفات تالیف "، " گلستانِ حجاز (سفرنامۂ حج) " اور " گلستانِ ہزار رنگ " ہیں۔ ادب میں آپ کے واحد شاگرد سید کاظم ہاشمی ہیں۔ اردو ادب میں آپ کے پسندیدہ شعراء اور ادباء روش صدیقی، اور مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔ ان دنوں شہر پٹنہ کے محلہ دریاپور میں سکونت پذیر ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

یعنی ہم سنگِ درِ یار سے آگے نہ بڑھے ۔۔۔ حوصلہ جرأتِ دیدار سے آگے نہ بڑھے
یہ مگر سبحہ و زنار سے آگے نہ بڑھے ۔۔۔ وسعتیں تھیں تو بہت شیخ و برہمن کے لئے

مرے نالہ ہائے سحر کبھی جو لبوں تک آ کے مچل گئے
ترے بام تک نہ پہونچ سکے تو غزل کے روپ میں ڈھل گئے

وہ فضائے میکدہ ساقیا نہ پتہ خرد کا نہ ہوش کا
یہ تری نگاہ کا فیض تھا کہ گرے تو گر کے سنبھل گئے

رہِ شوق کی وہ مسافتیں، وہ ہوائے تند کی شورشیں
تری خاکِ پا کے طفیل میں جو نکل گئے وہ نکل گئے

یہ عجیب سحر طرازیاں ہیں کلیمؔ یادِ حبیب کی
کبھی آ گئی تو تڑپ اٹھے، کبھی آ گئی تو بہل گئے

اعجاز حسین جاؔوید

مرزا اعجاز حسین نام، جاؔوید تخلص، اوائل ۱۹۱۲ء مطابق ۱۳۳۰ھ کو اپنے جدّی مکان واقع چوگھرا (نزد کشمیری کوٹھی) پٹنہ سٹی میں پیدا ہوئے تو بچپن میں مدرسہ سلیمانیہ میں تعلیم پائی اور مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ سے فاضل کی سند حاصل کی بعدہ طبیہ کالج پٹنہ سے فارغ التحصیل ہوئے۔ ابتدا میں چند سال مدرسۂ سلیمانیہ میں مدرسی کی خدمت انجام دے کر پٹنہ گرلس ہائی اسکول میں مستقل ملازمت اختیار کی۔

۲۹-۱۹۲۸ء سے ہی شعر کہنے لگے تھے۔ بہت کم گو تھے مگر جو کہتے خوب کہتے تھے۔ غالباً ۱۹۱۲ء میں پہلے پہل انھوں نے مدرسہ عباسیہ (جس کے پرنسپل مولانا محمد مصطفیٰ صاحب جوہر تھے اور شاعری میں یہ ان کے شاگرد تھے) کے مقاصدہ میں اپنا قصیدہ پڑھا تھا۔ اس بزم میں پڑھا جانے والا جاؔوید مرحوم کا قصیدہ، داؔنش صاحب اور دیگر لوگوں کے اجتماعی مجموعۂ کلام "عقدِ پروین" میں ۱۹۴۰ء میں چھپا تھا۔ صرف ۵۶ سال کی عمر پا کر جولائی ۱۹۶۸ء میں انتقال ہوا نمونۂ کلام حاضر ہے ؂

سرِ آسماں جو نہیں سہی، تو ہمیں بردئے زمین سہی
کہیں چین لینے دے زندگی، جو وہاں نہیں تو یہیں سہی

کوئی بندگی میں تو راز ہے، کہ خدا کو بندے پہ ناز ہے
کبھی رحمتوں سے نہ یاس ہو وہ ہزار تنگ، جبیں سہی

ترے سجدے کا ہے مٹا مٹا، وہ ہزار نقشِ جبیں مرا
تری بندگی کا نشاں تو ہے، ترے حسبِ حال نہیں سہی

محبت نے تاثیر ایسی دکھائی — کہ صحرا نوردی کی دل میں سمائی
فلک نے جب آفت کوئی سر پہ ڈالی — تو مغرور بندے نے کی جبہہ سائی

جوہر نظامی

سید احمد حسین اصلی نام، جوہر نظامی قلمی نام، ابن سید سجاد حسین مرحوم، شہرِ عظیم آباد کے محلہ دو ندی بازار پٹنہ سٹی میں ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے آپ کی علمی لیاقت، میٹرک، پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل اور جامعہ علی گڈھ سے ادیب کامل ہے۔ ان دنوں عظیم آباد کی مشہور و معروف لائبریری خدا بخش خاں اورینٹل پبلک لائبریری میں زیر ملازمت ہیں۔ شعر و سخن میں جناب سید نظیر حسین شائق عظیم آبادی سے مشورۂ سخن لیا اور ۱۹۳۲ء سے شعر و شاعری کے میدان میں آئے۔ شعری تخلیقات کے علاوہ ان کی نثری تخلیقات بھی ریڈیو سے نشر ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سارے رسالوں میں آپ کے مخصوص کلام شائع ہو چکے ہیں۔ ان رسالوں میں معارف، زمانہ کانپور، ہمایوں لاہور، سب رس حیدر آباد، ساقی دہلی، خیال، ندیم گیا وغیرہ۔ تصنیفات میں سیرتِ رسول، کلامِ جوہر نظامی، فردوسِ خیال، مطالعہ جگر مراد آبادی اور یادوں کے چراغ وغیرہ ہیں۔ شعر و سخن میں آپ کے کئی شاگرد بھی ہیں ان میں مخصوص سید شاہ احسان الحق عمادی اور ساغر حیدر آبادی وغیرہ ہیں۔ دیگر شاعروں اور ادب نوازوں کی طرح آپ بھی کچھ پسندیدہ شعراء ہیں جن سے آپ متاثر ہوئے ہیں ان میں غالب، میر انیس، میر تقی میر، شاد عظیم آبادی، اقبال، جوش، جگر، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی اور حسرت موہانی وغیرہ ہیں۔ اس کے علاوہ ہمعصر شعراء میں روش صدیقی

اختر ارینوی اور پرویز شاہدی وغیرہ بھی ہیں ۔ ان دنوں آپ درگاہ شاہ ارزاں پٹنہ میں سکونت پذیر ہیں ۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

گذر رہا ہے ادھر سے تو مسکراتا جا
کھلے نہیں ہیں جو غنچے انھیں کھلاتا جا

تجھے قسم ہے سکون آزما نگاہوں کی
کسی غریب کی تقدیر کو جگاتا جا

وہی نگاہ وہی اک تبسم رنگیں
چراغ انجمن یاس کو بجھاتا جا

جنوں نواز تری مست گامیوں کے نثار
کمند ہوش و خرد سے مجھے چھڑاتا جا

غریب خوردۂ بزم حیات ہوں یعنی
مری نگاہ سے اب یہ حجاب اٹھاتا جا

اٹھا کے چہرۂ رنگیں سے پردۂ اسرار
حریم دل کو پھر اک بار جگمگاتا جا

محمودہ خاتون

بی بی محمودہ خاتون نام محمودہ تخلص بنت شاہ علی محی الدین قدس سرہٗ واہلیہ سید شاہ محمد قائم صاحب قتیلؔ ۔ ۱۷ ر رجب المرجب ۱۳۲۱ھ کو پھلواری شریف پٹنہ میں پیدا ہوئیں ۔ مولانا شاہ محمد ہارون صاحب کی اہلیہ جو ان کی چچی اور پھوپھی بھی تھیں ، ان سے قرآن شریف ، حدیث اور تفسیر کا درس حاصل کیا ۔ شعر گوئی کا ذوق فطری تھا ۔ جو کچھ کہتی تھیں اسے اپنے رفیق حیات حضرت قتیلؔ کو دکھاتی تھیں ۔ آپ کی ایک سو بیس (۱۲۰) غزلوں کا مجموعہ موسوم بہ " گلستان سخن محمودہ " کو ان کے صاحبزادے پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ نے شائع کیا ۔ ۴ ر ربیع الاول ۱۳۰۴ھ کو دانا پور پٹنہ میں انتقال کیا ۔ اور پھلواری شریف میں حضرت تاج العارفین کے پائین مزار مدفون ہوئیں ۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

مسلسلہ کیوں عرش تک پہونچے نہ میری آہ کا
ثبت لوحِ دل پہ میرے نقش ہے اللہ کا

بعد مردن یاد میں اسکی خوشا اپنا عروج
پس کہ جسم زار اپنا ہے غبار اس راہ کا

صفحۂ دل پر مرے وحدت کی اسکی مہر ہے
داغ وہ رکھتی ہو جس سے ہے خجل رخ ماہ کا

پرتوِ توحید سے ہُو کا سماں ہے آنکھ میں
صفحۂ قلبِ حزیں ہے نقش اس درگاہ کا

کیوں نہ محمودؔ وہ ہوں سارے مرحلے طے خیر سے
مجھ کو وِرد اللہ کا ہے، شغل بسم اللہ کا

حسنؔ عظیم آبادی

سید حسن نام، حسنؔ تخلص، وطن عظیم آباد۔ ولادت ۱۳ر دسمبر ۱۹۱۳ء کو عظیم آباد میں ہوئی۔ آپ کے والدِ ماجد نواب سید نصیر حسین خاں صاحب پٹنہ کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور انگریزی تعلیم کے لئے محمڈن اسکول پٹنہ سٹی میں داخل ہوئے۔ جہاں سے انٹرنس پاس کیا۔ آئی۔ اے سے فراغت کے بعد ۱۹۳۷ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے امتیاز کے ساتھ بی۔ اے کیا' پھر اسی یونیورسٹی سے ۱۹۴۰ء میں اردو سے اور ۱۹۴۳ء میں فارسی سے ایم۔ اے کیا۔ دونوں میں اول آئے۔ اس شاندار کامیابی پر پٹنہ یونیورسٹی کی طرف سے طلائی تمغہ بھی ملا۔ اپنی پیشہ ورانہ مشغولیات کے تحت حیدرآباد' اور پھر چاٹگام کے کالج میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ آپ نے مولوی عبدالحق (بابائے اردو) کی قائم کردہ ترقیِ اردو کی شاخ چاٹگام میں ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۰ء تک خدمات انجام دیں۔ آپ کی نگارشات نظم و نثر (ڈھاکہ)، سہیل (گیا)، صبحِ نو (پٹنہ) نگار (لکھنؤ)

سب رس (حیدرآباد) ساغر (لاہور)، ساقی، افکار (کراچی) وغیرہ رسالوں میں شائع ہوئی ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

دعا اور نہ کوئی دوا چاہتا ہوں
دلِ غم طلب کی بقا چاہتا ہوں

تڑپنے دو جی بھر کے فرقت میں مجھ کو
میں اپنے کئے کی سزا چاہتا ہوں

سنا ہے فنا میں حصولِ بقا ہے
کسی کی طلب میں مٹا چاہتا ہوں

پرستش مری بے نیازی جزا ہے
کسی کو میں بے مدعا چاہتا ہوں

مجھے زندگی سے نہیں کوئی مطلب
فقط دردِ دل کی دوا چاہتا ہوں

بیک جلوہ جس نے حسن مار ڈالا
وہی دلبری کی ادا چاہتا ہوں

رضا نقوی واہی

سید محمد رضا نقوی نام، واہی تخلص۔ ابن مرحوم سید ظہور حسین، موضع کھجوا ضلع سیوان میں یکم فروری ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے۔ ان دنوں مستقل سکونت محلہ گردنی باغ پٹنہ میں ہے۔ آپ بہار کے لیجس لیٹیو کاؤنسل کے سکریٹریٹ میں اسسٹنٹ سکریٹری کے عہدہ پر فائز رہ چکے ہیں۔ اب ریٹائرڈ ہیں۔

آپ کی ادبی زندگی کا آغاز اسکول ہی سے ہوتا ہے۔ اور آج آپ ایک باکمال مزاحیہ شاعر کی شکل میں پہچانے جاتے ہیں۔ ظریفانہ کلام کے علاوہ نثر میں بھی اپنی خدمات مضمون کی شکل میں پیش کی ہیں، جو مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ریڈیو سے بھی آپ کی نگارشات برابر نشر ہوتی

رہتی ہیں۔ آپ کی مطبوعہ تصنیفات یہ ہیں:۔ واہیات (۱۹۵۰ء) طنز و تبسم (۱۹۶۲ء)، نشتر و مرہم (۱۹۶۸ء)، کلام نرم و نازک (۱۹۷۱ء)، نام بنام منظوم خط (۱۹۷۲ء)، متاعِ واہی (۱۹۷۸ء)، چٹ پٹی نظمیں (ہندی ۱۹۷۲ء)، اردو شاعری اور بہار (ہندی ۱۹۸۵ء)۔ ادبی خدمات کے عوض پٹنہ یونیورسٹی سے طنز و تبسم پر مبلغ دو سو پچاس روپے، کلام نرم و نازک پر ایک ہزار، نام بنام منظوم خط پر ایک ہزار اور متاعِ واہی پر دو ہزار روپے یوپی اردو اکاڈمی اور بہار اردو اکاڈمی سے تین ہزار روپے انعام کی شکل میں پا چکے ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہیں ؎

مہاجن

بھگوان سے شکوہ ہے مہاجن کو یہ دن رات
کیوں دل کو جلانے کے لئے آئی ہے برسات

کھیتوں پہ برستی ہوئی ساون کی گھٹا ہے
یا سانپ کلیجے پہ مرے لوٹ رہا ہے

بارش نے مری خواب کی دنیا کو اجاڑا
میں بھول گیا اپنے منافع کا پہاڑا

برسے گا جو کھیتوں پہ اسی طرح سے پانی
پھر کاہے کو ہوگی کبھی غلہ کی گرانی

جب قحط ہی اس سال نہ بھگوان پڑے گا
غلے کا ذخیرہ مری دوکاں میں سڑے گا

"غالب صدی اور اردو"

"اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے"
یعنی اردوئے معلّٰی کا مآل اچھا ہے
بات کڑوی سہی لیکن ہمیں کہنے دیجئے
"دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے"
جشنِ غالب نے جو بخشی ہے ذرا سی رونق
"وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے"

فضل امام واقف

سید شاہ فضل امام نام، واقف تخلص اور لسان الملک کے خطاب سے "متاعِ سخن" میں آپ کو نوازا گیا۔ واقف صاحب کی پیدائش ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۸ مارچ ۱۹۱۶ء کو شہر آرہ کے محلہ چودھرانہ میں ہوئی۔ شہر عظیم آباد میں پچھلے پندرہ برسوں سے سکونت پذیر ہیں۔ شاعری ورثہ میں ملی۔ کیوں کہ ان کے والد حضرت شاہ منظر امام صاحب کو داغ دہلوی سے عقیدت تھی۔ والد حضرت احمد علی عشرت گیادی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ انھیں حضرت حسان الہند علامہ تمنا بھلواروی سے باقاعدہ شرف تلمذ حاصل رہا ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

نہیں ہے سلطنتِ فصلِ گل تو کیا غم ہے — خزاں کا دورِ حکومت تو اور بھی کم ہے
یہ آبگینۂ دل وقفِ ضربِ پیہم ہے — نفس کی آمد و شب زندگی کا ماتم ہے
یہ اضطراب لئے صبحِ انقلاب آئی — چراغِ شامِ غریباں کی روشنی کم ہے
ستم ظریف ہے کتنا جمالِ فطرت بھی — بہارِ خندۂ گل نمیض اشکِ شبنم ہے
اسی کو ڈھونڈ، وہیں حرفِ مدعا ہوگا — کتابِ درسِ محبت کا جو ورق کم ہے
جوابِ نغمۂ چنگ و رباب ہے واقف — شکستِ دل کی جو آواز آج مدھم ہے

دانش عظیم آبادی

سید عضنفر نواب نام، دانش (پہلے شوق) تخلص خلف نواب سید یاور حسین کی پیدائش ریاست بہار کے ممتاز خاندان "گذری" میں ۱۴ صفر

رنگ انڈیل دیتی ہے۔ ارضی مظاہر سے قربت کا احساس شاعری کے علاوہ ناول، ڈرامہ اور افسانہ میں بھی ظاہر ہوا۔ ان اصناف نے ماحول اور اس کی اشیاء سے قریبی رشتہ استوار کیا ہے۔ موجود کے عقب یا بطون میں جھانک کر نامعلوم کو مس کرنے کی کاوش، تنقید اور تحقیق میں بھی نظر آتی ہے۔ دبستانِ عظیم آباد نے آدمی کے بطون میں انسان کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ انسان صرف اخلاقی سطح کے محض ایک وصف کا نمائندہ نہیں ہے بلکہ موجود کے زنداں سے باہر آنے کے لئے بیتاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی سطح پر کئی تحریکیں جنم لیتی رہیں۔ کئی ادبی محاذ وقوع پذیر ہوتے رہے جو ایک آدرش، نصب العین اور نظامِ خیال بھی مہیا کرتے رہے ہیں۔

سلطان آزاد نے انسان کی ایسی ہی جڑوں کو تلاش کیا ہے۔ ان کی کتاب "دبستانِ عظیم آباد" اپنی ذات ہی کا منکشفہ نہیں، ایک ایسا تہذیبی وظیفہ بھی ہے جس سے افراد کے باطنی چہروں اور رویوں کے ساتھ، اجتماعی چہرے اور رویے اور قومی شناخت کی اندرونی پرتیں بھی اجاگر ہوتی ہیں۔ یہ کتاب اپنی جغرافیائی حرمت، ثقافتی خوشبو اور حال کے تضادات سے ہم آہنگ ہو کر ایسے امکانات پیدا کرتی ہے جس سے نہ صرف ماضی کی طرف واضح اشارے ملتے ہیں اور مستقبل کی طرف پیش رفت ہوتی ہے۔ بلکہ اجتماعی ہیئت کو نکھارنے اور سنوارنے کا جذبہ بھی سر ابھارتا ہے۔ ادب ایک سماجی عمل ہے۔ ادب کے وسیلے سے مختلف سماجوں اور معاشروں نے اپنے مجموعی اندازِ فکر، مختلف رویوں، اپنی ثقافت اور اپنے شعور کا اظہار کیا ہے۔ ادب کو ہر مہذب معاشرہ نے صرف گہری توجہ کا مستحق ہی نہیں سمجھا بلکہ ادب کے آئینے میں اپنے بطون کو تلاش کیا ہے۔ یہ کتاب قوم کی اقدار کا تخلیقی اظہار ہے اور کئی ادوار کے اندازِ فکر کی نہایت معتبر شہادت بھی ہے۔ ایسی شہادت کہ دوسری تاریخی دستاویزیں اس کی جگہ نہیں لے سکتیں۔ کیوں کہ ان دستاویزوں میں انسانی شعور اور لاشعور کی آویزش، نزاع اور معاشرہ کی ایسی کشمکشِ عمل اور عمل کا ایسا

۱۳۳۵ھ مطابق ۱۰ دسمبر ۱۹۱۶ء کو محلہ حمام پٹنہ سٹی میں ہوئی۔

شعر و سخن میں آپ کسی کے شاگرد نہیں ہوئے لیکن اپنے سے پیشتر تمام صاحبِ طرز شعراء کو اپنا استاد ضرور تسلیم کرتے ہیں۔ اس کا اظہار خود انھوں نے اپنی ایک رباعی میں کیا ہے ؎

گو میں رہا تقلید سے یکسر آزاد — مضبوط ہے لیکن مرے فن کی بنیاد
ہے میرا کمال اگلے ذی کمالوں کا فیض — ہیں ایک نہیں سیکڑوں میرے استاد

آپ کی ادبی زندگی کا آغاز یعنی شعر و شاعری کا شوق ۱۴-۱۵ سال کی عمر سے تعلیم کے دوران ہی ہوتا ہے۔ اس کے بعد کئی مشاعروں اور قصیدہ خوانی میں شرکت کی۔ یوں تو آپ نے شعر و سخن کی تمام اصناف پر طبع آزمائی کی۔ لیکن غزل کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے۔ آپ کی مطبوعہ تصنیفات: "عقدِ پروین" (دوستوں کے اجتماعی کلام کا مجموعہ ۱۹۴۰ء) "پرواز" (۱۹۵۴ء) "سازِ آواز" (۱۹۷۸ء) اور "مثنوی اشکِ غم" (۱۹۷۹ء) ہیں، جو منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ شعر و سخن کے علاوہ نثر میں بھی آپ کی خدمات کم نہیں ہیں۔ شعری اور نثری دونوں تخلیقات ہندوستان کے اہم رسالوں اور ریڈیو سے شائع اور نشر ہو چکے ہیں۔ آپ کی ادبی خدمات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بہار اردو اکاڈمی ۱۹۷۹ء میں اسپیشل انعام مبلغ تین ہزار روپئے سے بھی نواز چکی ہے۔ فنی حیثیت سے ہر شاعر و ادیب کی نظر میں اس کے کچھ مخصوص فنکار ہوتے ہیں اور کسی نہ کسی حد تک ان سے وہ ضرور متاثر ہوتا ہے۔ لہٰذا آپ فارسی شعراء میں حافظ و عرفی اور اردو کے شعراء میں راسخ، غالب، اقبال اور شاد سے متاثر ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ معاصرین میں زار عظیم آبادی، جمیل مظہری، اجتبیٰ حسین رضوی، جوش اور پروین شاہدی آپ کے پسندیدہ اور محبوب شعراء ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہیں ؎

جلوے تھے سو کرشمۂ آئینہ گر کے بعد — اب تم ہی تم ہو سرحدِ فکر و نظر کے بعد

میری جبینِ شوق کی تسکیں نہ ہو سکی
آ گے کچھ اور بھی ہے ترے سنگِ در کے بعد

اے عندلیب اس سے بھی آزاد ہو کے دیکھ
کوئی قفس نہیں، قفسِ بال و پر کے بعد

دیوانگی کا اپنی ٹھکانا کہیں نہیں
صحرا کو بھی تباہ کیا اپنے گھر کے بعد

ہم تو آ سکتے نہیں منزلِ یزداں کے قریب
تم ہی آجاؤ ذرا سرحدِ امکاں کے قریب

رمزؔ عظیم آبادی

رضا علی خاں نام، رمزؔ تخلص ابن قدرت اللہ خاں مرحوم، سکونت کوڑا شاہ منزل، مرزا معشوق علی روڈ پٹنہ سٹی۔ رمزؔ عظیم آبادی کی پیدائش ۱۹۱۶ء کو شہر عظیم آباد کے محلہ پٹنہ سٹی میں ہوئی۔ آپ کی شاعری کا آغاز رمضان کے قصیدے کی شکل میں ۱۹۴۷ء سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد ۱۹۴۹ء سے باقاعدہ شاعروں کی صف میں شامل ہوئے۔ مشاعرہ میں بھی حصہ لینا شروع کیا۔ موصوف نے اپنی زندگی میں سب سے پہلے لودیکٹرہ پٹنہ سٹی کے مشاعرہ میں حصہ لیا تھا۔ جس میں آپ نے جو کلام سنایا تھا اس کی طرح یہ تھی ؎

کہاں کہاں لئے پھرتی ہے جستجو تیری

آپ کے ادبی اساتذہ کے نام بالترتیب یہ ہیں:۔ منتظرؔ عظیم آبادی، ثاقبؔ عظیم آبادی اور پرویز شاہدی — دیگر اہم شاعروں کی طرح آپ نے بھی شعر و سخن کے تمام اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن نظم کی طرف زیادہ مائل ہوئے۔ آپ کے اکثر و بیشتر کلام قوالی کی شکل میں بھی سنے گئے ہیں۔ ان دنوں آر پی۔ ڈبلو۔ ڈی میں زیر ملازمت ہیں۔ آپ کے

مخصوص شاگردوں میں معین کوثر، ظفر حسن نجمی، نرمی، کیف عظیم آبادی، اختر عظیم آبادی اور خادم بلخی دیزہ ہیں۔ آپ کے پسندیدہ شعراء میر، غالب، شاد، جوش، پروین شاہدی اور جمیل منظری ہیں۔ ان کی مخصوص تخلیقات میں نقشِ دوام، بہاروں کی دنیا، زمین، مسیح و صلیب، بوئے حنا، رقصِ حیا، اور صنم حرم (اردو)۔ نمونۂ کلام میں آپ کی مشہور نظم "بہاروں کی دنیا" ملاحظہ ہے ؎

مسرت کی وادی نظاروں کی دنیا یہی سرزمیں ہے
جنوں خیز منظر بہاروں کی دنیا یہی سرزمیں ہے
سفیدوں کی دلکش قطاروں کی دنیا یہی سرزمیں ہے
بنفشہ کا مزرع چناروں کی دنیا یہی سرزمیں ہے
مشیت کے آئینہ داروں کی دنیا یہی سرزمیں ہے
جو منکر ہیں جنت کے آئیں وہ جنت کی تصویر دیکھیں
جسے دستِ قدرت نے خود ہی سنوارا وہ تعمیر دیکھیں
مکمل ہے کتنی حدیثِ مشیت کی تفسیر دیکھیں
زمیں جس کے دم سے سہاگن بنی ہے وہ کشمیر دیکھیں
بہار آفریں مرغزاروں کی دنیا یہی سرزمیں ہے
یہ شہتوت جیسے حسینوں کی انگلی میں مہندی رچی ہے
یہ انگور جیسے سہاگن کے کانوں میں بالی پڑی ہے
یہ سیب احمریں جن میں رخسارِ جاناں کی رنگت چھپی ہے
یہ خوبانیاں جن کے سینے میں ہونٹوں کی صہبا بھری ہے
غزل کے حسیں استعاروں کی دنیا یہی سرزمیں ہے
جواں حوصلہ اہلِ کشمیر آغوشِ صنعت کے پالے

شب و روز قالین سازی کی محنت پہ خوش ہیں جیالے
دو شالوں پہ گلکاریاں ہو رہی ہیں اندھیرے اجالے
جہاں لکڑیوں پر ہیں باریک نقاشیاں کرنے والے
وہ صنعت کدہ دستکاروں کی دنیا یہی سرزمین ہے

حسیں ڈل کے سینے میں سیال چاندی کی موجیں رواں ہیں
اس آئینہ خانے میں حسنِ ازل کی سی رعنائیاں ہیں
صنوبر کے سائے میں لرزیدہ ہونٹوں کی سرگوشیاں ہیں
یہاں کے مناظر میں رخسار و گیسو کی پرچھائیاں ہیں
مشیت کے ان شاہکاروں کی دنیا یہی سرزمین ہے

نند کشور پرساد نند

نند کشور پرساد نام، نند تخلص، بابو چندر پرساد سنگھ کے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ ان کی پیدائش توی گڑھ ضلع مونگیر میں یکم جنوری ۱۹۱۷ء کو ہوئی۔ ان کے بڑے بھائی بابو بالیشور پرساد سنگھ اردو اور فارسی زبان و ادب کے ماہر تھے۔ جن کی تربیت سے نند جی بھی اردو اور فارسی زبان و ادب کے رسیا ہو گئے۔ اپنے ادبی ذوق کی خاطر محمد قربان علی قوس بھاگلپوری سے اصلاح سخن بھی لی۔ ان کی مشقِ سخن کا آغاز غزل گوئی سے ہوا۔ اپنے ابتدائی دور میں مشاعروں میں بھی اکثر شرکت کرتے تھے۔ ادھر ان کے کئی کلام پٹنہ اور بھاگلپور ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں۔ موصوف کی علمی لیاقت بی۔ اے، بی۔ ایل ہے اپنی پیشہ ورانہ مشغولیات کے تحت ڈسٹرکٹ جج

کے عہدہ پر فائز رہنے کے بعد اب ریٹائرڈ ہو چکے ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے بنام نظارۂ خیال (سنہ ۱۹۶۴ء) اور عکسِ تمنا (سنہ ۱۹۸۰ء) مطبوعہ تصنیفات ہیں۔ جو منظرِ عام پر آکر دادِ تحسین وصول کر چکی ہیں۔ فنی طور پر شاد عظیم آبادی اور عطا کاکوی ان کے پسندیدہ شعرا ہیں۔ ان دنوں مستقل طور پر راجندر نگر پٹنہ میں سکونت پذیر ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

جہاں بھی قصۂ دردِ غمِ الفت بیاں ہو گا ۔۔۔ ہمارا ذکر ہی محفل میں زیبِ داستاں ہو گا
ہر اک شاخِ گلِ تر پر بنا دل چھپا ئیں گے ۔۔۔ نظر جس سمت جائے گی وہ میرا آشیاں ہو گا

باندھ دوں گا میں ابھی دستار ہر کانٹے کے سر ۔۔۔ دیکھ اے صحرائے وحشت میرے دامن کو نہ چھیڑ
ذرے ذرے سے اٹھے گا اک شہیدِ جستجو ۔۔۔ اے ہوائے تند میری خاکِ مدفن کو نہ چھیڑ
دیکھ اے گلچیں نہ برہم ہو مزاجِ گلستاں ۔۔۔ توڑ کر پھولوں کو بزمِ اہلِ گلشن کو نہ چھیڑ

نظر عظیم آبادی

سید محمد احسان نام، نظر تخلص، فریادی نسبت نسبی ہے۔ والد سید محمد رشید اور نانا مولانا شاہ محمد رشید الحق سجادہ نشین خانقاہ عمادیہ منگل تالاب ہیں ۲۵ رجمادی الثانی سنہ ۱۳۳۵ھ کو پیدا ہوئے۔ چار سال کے تھے کہ والد کے شفقت سے محروم ہو گئے۔ ننہال میں پرورش پائی۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ فارسی اور کچھ عربی بھی پڑھی۔ شروع میں بطور خود شعر موزوں کرتے رہے۔ مگر سنہ ۱۹۳۸ء سے باضابطہ اصلاح لینی شروع کی۔ پہلے ڈاکٹر مبارک حسین مبارک عظیم آبادی سے پھر حمید عظیم آبادی سے کلام پر اصلاح لیتے رہے۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں ترکِ وطن کر کے مشرقی پاکستان چلے گئے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

آپ کے حسنِ تغافل نے بڑا کام کیا
کل جو تھی آج بھی آرام کی دنیا ہے وہی

ہم جلاتے رہے دنیا میں وفاؤں کے چراغ
اپنے ہی دل میں مگر غم کا اندھیرا ہے وہی

آج بھی حسن طلبگارِ وفا ہو تو سہی
آج بھی سر میں مرے عشق کا سودا ہے وہی

وقت کی بات ہے، محرومِ تلطف ہے نظر
ورنہ ساقی ہے وہی، گردشِ مینا ہے وہی

منظر صدیقی

نور محمد صدیقی نام، منظر تخلص ابن مغل جان صدیقی سنہ ۱۹۱۷ء کو شہر عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ شاعری کا شوق اٹھارہ سال کی عمر سے ہوا۔ چند سال تک کسی سے اصلاح لئے بغیر اشعار کہتے اور پڑھتے رہے۔ پھر جناب اصغر کلکتوی تلمیذ جلال لکھنوی سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے رہے۔ حضرت اصغر کی وفات سنہ ۱۹۴۰ء سے پہلے ہوئی۔ آپ سنہ ۱۹۴۴ء میں ریلوے ملازم ہوئے اور ۲۲ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کو پار بتی پور مشرقی پاکستان تبادلہ ہوگیا۔ پھر سنہ ۱۹۵۲ء میں آپ کا تبادلہ کھلنا (مشرقی پاکستان) ہوگیا۔ اور آخری ایام وہیں گذرے۔ یکم محرم الحرام سنہ ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۵ ستمبر بروز جمعرات وفات پائی۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

مسخر کر چکا ہر ایک میکش کو وقار اپنا
تری مستی پہ سبقت لے گیا ساقی خمار اپنا

پسِ مردن بھی باقی ہے وہی عز و وقار اپنا
ہوا کے دوش پہ تفریح کرتا ہے غبار اپنا

اب اس سے بڑھ کے اپنی نیکنامی اور کیا ہوگی
کہ ذکر خیر اس محفل میں آیا بار بار اپنا

بہار آنے تو دو ہم دشتِ وحشت کو نوازیں گے
دکھا دیں گے تماشا کر کے دامن تار تار اپنا

بتوں کو روز ہم سجدہ کریں؟ یہ ہو نہیں سکتا
خدائے وحدہٗ لاریب ہے پروردگار اپنا

رفیق ایسا نظر آیا نہ کوئی آج تک منظر
جو ہوتا ہم نشیں اپنا جو ہوتا غمگسار اپنا

ڈاکٹر ہمدم عظیم آبادی

سید احمد سہیل رضوی نام، ہمدم تخلص خلف الحاج مولوی سید محمد عرف چھیدی کی پیدائش ۲۵ دسمبر ۱۹۱۸ء کو پٹنہ میں ہوئی آپ نے اردو فارسی اور دینیات کی تعلیم گھر پر مکمل کرنے کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول پٹنہ سٹی سے میٹرک سکنڈ ڈویژن میں کیا اور آئی۔ ایس۔ سی بھی سکنڈ ڈویژن سے کیا۔ ۱۹۵۳ء میں میڈیکل کالج پٹنہ یونیورسٹی سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری حاصل کی ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۲ء تک ضلع پٹنہ کے سرکاری نیم سرکاری اسپتالوں میں میڈیکل آفیسر رہے۔ اور ۲۳ جولائی ۱۹۶۷ء کو مع اہل وعیال کراچی چلے گئے۔

مزاج بچپن سے ہی شاعرانہ تھا اور گھر کا ماحول بھی علمی تھا شاعری میں دو گرامی اساتذہ ثاقب عظیم آبادی اور وحشا کاکوی سے شرف تلمذ حاصل رہا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

آپ کے در کا جو بھی گدا ہو گیا — اس کا شاہوں سے رتبہ بڑا ہو گیا
پست جو حوصلے تھے ہوئے اوج پر — آتے ہی آپ کے کیا سے کیا ہو گیا
ظلمتیں چھا رہی تھیں جہاں چار سو — آپ کا نور شمس الضحیٰ ہو گیا
ان کی محبوبیت کا ہے کہنا ہی کیا — جن کے عاشق پہ عاشق خدا ہو گیا
پائے اقدس کی برکت سے خاک زمیں — کا فلک سے بھی رتبہ سوا ہو گیا

جادۂ عشق کے راہرو کے لئے
راہ بر آپ کا نقشِ پا ہو گیا

جعفرالنسا جمالؔ

جعفرالنساء بیگم عرف عُظمیٰ بیگم نام، تخلص جمالؔ۔ ایک شعرگو کی حیثیت سے غیرمعروف و گمنام ہیں۔ آپ غضنفر نواب دانشؔ عظیم آبادی کی شریکِ حیات تھیں۔ آپ نے بہت تاخیر سے ۱۹۴۵ء میں شاعری شروع کی۔ اصلاح دانشؔ صاحب کر دیا کرتے تھے۔ خود دانشؔ صاحب آپ کے متعلق فرماتے ہیں کہ "میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے کبھی ان کی ہمت افزائی نہیں کی نتیجتہً وہ باضابطہ شاعرہ تو نہیں بن سکیں مگر شعر فہمی اور نقد و تبصرہ کی خاص لیاقت ان میں پیدا ہو گئی تھی۔" اب سرِ دست دانشؔ صاحب کے پاس ان کی چند غزلیں موجود ہیں۔ مرحومہ نے ۵۶ رسال کی عمر میں جولائی ۱۹۷۴ء کو انتقال کیا۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

کہانی ایسی کبھی سنی تھی؟ ذرا بتاؤ تو منصفانہ
بس اور کچھ دیر دل سنبھالو، تمام ہے اب مرا فسانہ

کچھ ایسے بے کیف آدمی بھی نظر آنے لگے ہیں جن کا
کبھی ہے یارانہ محتسب سے، کبھی ہے ساقی سے دوستانہ

گزر گیا عہد شادمانی، رہی نہ باقی کوئی نشانی
بہار اب ہے، نہ باغ و بلبل، نہ شاخِ گل اور نہ آشیانہ

نہ شوقِ پرواز کی خطا ہے، نہ جذبۂ سیرِ بامِ ناقص
لکھا ہوا تھا مرے مقدر میں اب قفس ہی کا آب و دانہ

غم و خوشی زندگی میں اپنی، کچھ ایسے گھل مل کے رہ گئے ہیں
جمالؔ میرے لئے ہے یکساں، فغاں ہو یا نغمہ و ترانہ

نقی احمد ارشاد

سید نقی احمد نام، ارشاد تخلص، ابن سید حسین خاں مرحوم خلف شاد عظیم آبادی کی پیدائش شہر عظیم آباد کے محلہ حاجی گنج شاد منزل میں ۵ جولائی ۱۹۳۰ء کو ہوئی۔ موصوف کی علمی لیاقت ایم۔ اے (تاریخ) ہے۔ لیکن اس کے علاوہ سنسکرت سے بھی واقف ہیں۔

ارشاد صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۷ء سے ہوا۔ اصناف سخن میں شاد عظیم آبادی، امداد عظیم آبادی اور حمید عظیم آبادی سے غزلوں پر اصلاحیں لیں۔ شعر و شاعری کے علاوہ نثر نگاری میں بھی اپنی ایک حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کے بیشتر مضامین و مقالات ندیم، صبح نو، شاعر، جام جم، نگار اور ساقی جیسے ہند و پاک کے معیاری رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ریڈیو پٹنہ سے بھی کئی بار آپ کی تخلیقات نشر ہوئی ہیں۔ ان کی مطبوعہ تصنیفات: مرثی شاد جلد اول اور دوم، کلام شاد، سروش ہستی (مجموعہ قطعات) فروغ ہستی (مجموعہ مسدس)، مجموعہ غزلیات، مرثی، منظومات، رباعیات وغیرہ ہیں۔ موصوف کے پسندیدہ شعراء حافظ، خسرو، بیدل، شاد، غالب، اقبال اور فیض ہیں۔ ملازمت کے سلسلے میں ۱۹۴۳ء میں سب ڈپٹی کلکٹر، ۱۹۵۵ء میں ڈپٹی کلکٹر، ۱۹۷۰ء میں کلکٹر (اے۔ ڈی۔ ایم) اور ۱۹۷۷ء میں جوائنٹ سکریٹری کے عہدوں پر فائز ہونے کے بعد اگست ۱۹۷۸ء میں ریٹائر ہو گئے آج کل کنکر باغ کالونی پٹنہ میں سکونت پذیر ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے ؎

دیارِ حسن سے تا شہرِ لامکاں گونجی کہاں کہاں نہیں آوازِ عاشقاں گونجی

اسی نوا کو کہا بلبلوں نے بانگِ سروش — صدا بہار نے دی صوتِ کن فکاں گونجی
زمیں یہ کیا ہے، ستاروں نے بھر لئے دامن — جو تیری یاد میں یہ آہِ گل فشاں گونجی
لئے ہوئے ہیں ترانوں سے وہ حسیں کوچے — جہاں جہاں مری آوازِ کارواں گونجی

کس کی پازیب کے بجتے ہوئے گھنگھرو نکلے — رات آئی کہ تیری یاد کے جگنو نکلے

غبار بھٹی

مشتاق احمد اصلی نام، غبار بھٹی قلمی نام ابن مولانا نثار احمد نثار مرحوم اپنے وطن بارہ بنکی میں نومبر ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے۔ فی الحال کئی برسوں سے پٹنہ میں ہیں۔

آپ کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۸ء سے ہوتا ہے۔ مولوی محبوب علی محب، مختار منشی کامل، مولانا حسرت موہانی، حکیم ہادی رضا، حکیم مینے آغا فاضل اور حکیم باقر حسین شاعر آپ کے ادبی اساتذہ ہیں۔ آپ کے کلام ہندوستان کے مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ طبابت اور تالیف و تصنیف آپ کی مشغولیات میں شامل ہیں۔ "ننھی روح" (۱۹۴۲ء) اور "پروازِ غبار" (۱۹۵۷ء) آپ کی مطبوعہ تصنیفات ہیں۔ غالب، اقبال اور حسرت موہانی آپ کے پسندیدہ شعرا ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

وہ عالم تھا شمس و قمر مسکرائے — سوئے دل جو وہ دیکھ کر مسکرائے
ستم ہے ستم یہ تقاضائے الفت — کہ رویا کرے دل نظر مسکرائے
ٹپکتے رہے ہیں مری آنکھوں سے آنسو — ستارے مگر رات بھر مسکرائے
یہ حسنِ تعلق، یہ دل کا مقدر — وہ دل کی طرف دیکھ کر مسکرائے

سلسلہ نہیں ملتا جس سے ادب عبارت ہے۔

اس کتاب میں تنقیدی شعور کا سراغ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ ابھی تک دبستانِ عظیم آباد پر جو بھی کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ نقد و تبصرہ کے اعتبار سے سرسری اور مختصر ہیں اور تاریخ نویسی کے لحاظ سے نامکمل اور تشنہ ہیں۔ بیسویں صدی میں ادب کا مطالعہ 'اقدار' کا مطالعہ ہو گیا ہے۔ اس لئے تذکروں کو محض معلومات کا ذخیرہ نہیں ہونا چاہئے اور شعراء و ادباء کے حالاتِ زندگی پر اب تک جس قدر زور دیا جاتا رہا ہے وہ کافی نہیں ہے بلکہ شخصیت کے ارتقاء اور اس کے ماحول کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے ـــــ سلطان آزاد اس پل صراط سے کامیابی سے گذرے ہیں کیوں کہ انھوں نے "دبستانِ عظیم آباد" میں تحقیق و تلاش سے کام لیتے ہوئے اس حقیقت کی طرف اشارے کئے ہیں کہ ایک فنکار اپنی تخلیقات کو کن حالات میں پیش کرتا ہے' اس کے زمانے میں تصنیف و تالیف کا کیا رجحان تھا۔ اپنے پیشروؤں اور ہمعصروں سے اس نے کس حد تک اثرات قبول کئے اور کہاں تک اپنی قوتِ نقد سے کام لے کر ادبی اجتہاد کے لئے راستہ ہموار کیا۔ وہ کس حد تک اپنے دور کی نمائندگی کرتا ہے۔ اور کہاں تک اس سے مختلف ہے۔ کن اسباب کی بنا پر اس نے اختلاف کیا۔ اور اس میں وہ کہاں تک کامیاب رہا' اور آج ہم اس سے کیا سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ کتاب میں منظوم اور نثری نمونوں سے ہم اسے پرکھ سکتے ہیں۔

سلطان آزاد نے اپنی اس کتاب میں ادبی تاریخ کو ایسے سانچے میں ڈھالا ہے کہ تاریخ کے سارے اجزاء ایک ہی سلسلے کی کڑیاں معلوم ہوتے ہیں۔

سلطان آزاد ابن محمد عثمان (ریٹائرڈ، مونوکریکٹر) کی پیدائش صوبہ بہار کے دارالسلطنت پٹنہ (عظیم آباد) کے محلہ گلزار باغ میں ۲ر جولائی ۱۹۵۸ء کو ہوئی۔ دینی اور ابتدائی تعلیم والدہ ماجدہ سے حاصل کی۔ لیکن کلام پاک و دیگر مذہبی

نشاط عظیم آبادی

سید شاہ مظہر حسین نام، نشاط تخلص۔ حضرت سید شاہ فدا حسین بارگاہ فیاضہ سملی پٹنہ کے سجادہ نشین کے صاحبزادے ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ شاعری میں حضرت حمید عظیم آبادی سے شرف تلمذ حاصل رہا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

جس جگہ اے گلِ وحدت تری نکہت ہوگی
بلبلِ باغِ رسالت کی وہ جنت ہوگی
جب تو فرمایا قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّی
پردۂ روح میں شاید تری نزہت ہوگی
صرف نقطے ہی میں محدود ہے ساری تعداد
اسی نقطے میں نہاں وحدت و کثرت ہوگی
عشرتِ دیرِ صنم کی بھی کرو فکر نشاط
دل سے کب دردِ محبت پہ قناعت ہوگی

ہوش عظیم آبادی

سید ارتضیٰ حسین المتخلص بہ ہوش، خلف سید وارث حسین سکونت دولی گھاٹ پٹنہ سٹی ہے۔ آپ کی پیدائش عظیم آباد کے محلہ میتن گھاٹ میں پانچ جنوری ۱۹۲۱ء کو ہوئی۔

آپ کی ادبی زندگی کا آغاز بچپن سے ہی ہوتا ہے۔ جب ایک بار آپ کے والد نے شاؔد عظیم آبادی کا ایک شعر لکھ کر پڑھنے کو دیا تھا۔ جسے آپ نے بڑے ہی اچھے ڈھنگ سے پڑھ کر سنایا۔ اس سے والد صاحب تو خوش ہوئے ہی، ساتھ ہی انھیں شعر و سخن میں ایک لذت محسوس ہوئی۔ جس کے نتیجے میں ان کے کورے مزاج پر شاعری کا رنگ آہستہ آہستہ چڑھنے لگا۔ لیکن بہت دنوں تک خاموش شاعری کرتے رہے۔ یعنی ان کی شاعری کا دوسروں کو علم نہ تھا۔ لیکن جب باضابطہ طور سے مشاعرے میں حصہ لیا تو ایک اچھے شاعر کی شکل میں پہچانے گئے۔ آپ نے شعر و سخن کی تمام اصناف پر طبع آزمائی کی۔ لیکن مخصوص طور پر غزل اور مرثیہ زیادہ کہا۔ شعر و سخن میں کسی سے مشورہ نہیں لیا البتہ مرثیہ میں کاظم حسین زاؔر سے اصلاح لی۔ آپ بہار سرکار کے پندرہ روزہ اردو رسالہ "بہار کی خبریں" کے اڈیٹر بھی رہ چکے ہیں۔ اب محکمۂ نشر و اشاعت کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہیں۔ دیگر شاعروں کی طرح آپ کے پسندیدہ شعراء اقبالؔ، جوشؔ، شاؔد اور جمیلؔ مظہری ہیں۔ نمونۂ کلام پیش ہے ؂

آپ کی چشمِ کرم کب نگراں ہوتی ہے
آرزو ٹھوکریں کھا کھا کے جواں ہوتی ہے

ہے محبت بھی عجب چیز کہ چاہیں تو نہ ہو
اور جو ہوتی ہے تو بے وہم و گماں ہوتی ہے

کر کے پرورشِ جذبۂ عصیاں میں نے
تیز کی روشنیِ عالمِ امکاں میں نے

کل جو دیکھا طرفِ خانۂ دیر اس میں نے
پھاڑ کے پھینک دی تصویرِ بیاباں میں نے

حسیر عظیم آبادی

سید محمد قاسم رضوی نام، حسیر تخلص۔ عظیم آباد کے باشندہ اردو کے اچھے شاعر اور انشاء پرداز تھے۔ مختلف علمی رسالوں (ماہنامہ ادیب الہ آباد) کے اڈیٹر رہے۔ اس کے ماسوا نقاد بھی تھے۔ علاوہ ازیں دوسرے بلند پایہ رسالوں میں بھی ان کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ آپ کی وفات ۱۹۶۲ء میں ہوئی۔ عمر اس وقت چالیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ نمونہ کلام یہ ہے ؎

فلک پر جو شمس و قمر دیکھتے ہیں — تو ہم اپنا داغِ جگر دیکھتے ہیں
سنا ہے جب سے وہ ہیں آنیوالے — تو پھر پھر کے دیوار و در دیکھتے ہیں
وہ آئینہ کے روبرو محوِ صورت — ادھر دیکھتے ہیں ادھر دیکھتے ہیں
شفق ان کی آنکھوں میں کیا جلوہ گر ہے — کہ شام و سحر دوپہر دیکھتے ہیں
نزاکت کی حد ہے کہ ہر ہر قدم پر — وہ چلنے سے پہلے کمر دیکھتے ہیں
نہ مرتے ہیں بت پر نہ حوروں پہ زاہد — تماشا صنم کا مگر دیکھتے ہیں
کلیسا ہو کعبہ ہو یا طورِ سینا — سب اس کے ہی جلوہ کا گھر دیکھتے ہیں
وہی ہے حسیر آپ کہتے ہیں سب سے — جسے کو بکو — دربدر دیکھتے ہیں

سرور عظیم آبادی

سید مبارک حسین نام، سرور تخلص۔ حضرت حمید عظیم آبادی

کے سب سے بڑے فرزند ہیں۔ ۲۵ اگست ۱۹۲۴ء کو محلہ لودیکرہ پٹنہ سٹی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گھر میں اپنے والدِ محترم سے حاصل کی۔ بچپن ہی میں فارسی اور اردو پر دسترس حاصل کی پٹنہ کالج سے بی۔ اے نمایاں حیثیت سے پاس کیا۔ اور تعلیمی ڈپلوما بھی پٹنہ ٹریننگ کالج سے حاصل کیا۔ تقسیم ہند سے قبل ۱۹۴۶ء میں اپنے بزرگوں کے ساتھ کراچی تشریف لے گئے۔ اور وہاں ایک اسکول میں ملازمت کرلی اور وہاں جامعہ سندھ سے ایم۔ اے بھی کیا۔

سرور کو بچپن ہی سے شعر و ادب کا شوق تھا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد اکثر و بیشتر مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ سہ ماہی رسالہ "جامِ جم" کا اجراء آپ کی کاوشوں سے ہوا۔ متعدد انگریزی کتابوں کے ترجمے کئے۔ آپ کی اہم تصانیف "کتاب شہریت" "سیاسی افکار" اور "ارتقائے تمدن" ہیں۔ شاعری میں رباعی، سلام، نظم اور غزل پر طبع آزمائی کی۔ اصنافِ سخن میں اپنے والد سے شرفِ تلمذ رہا۔ آپ کی شاعری ماحول کی صحیح عکاسی، جذباتِ دلی اور وارداتِ قلبی کا مرقع ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

تری ہر ادا میں پنہاں مری زیست کا سہارا
کبھی عشرتِ توجہ کبھی دعوتِ نظارا
وہ کہاں سکون ڈھونڈے، اسے کون دے سہارا
جسے دوستوں نے لوٹا، جسے دوستوں نے مارا
یہ بجھی بجھی سی شمعیں، یہ گھٹی گھٹی فضائیں
نہ اجازتِ فغاں ہے نہ ہی ضبطِ غم کا یارا

نہ شکایتِ زمانہ، نہ غمِ جفائے یاراں
تری یاد کے سہارے مجھے ہر الم گوارا
میں سرورِ تشنہ لب ہوں، مرا حصہ تلخ کامی
جو ہے ناگوار سب کو، مجھے وہ بھی ہے گوارا

کلیم عاجز

کلیم الدین نام، عاجز تخلص ہے۔ ۱۱ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو تلہاڑہ ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۶ء کی خونی داستان نے سوز و گداز سے زندگی کو بھر دیا۔ لٹ پٹ کر پٹنہ آئے اور پھر یہیں رہ گئے۔ میٹرک کے بعد اعلیٰ تعلیم پٹنہ میں رہ کر حاصل کی۔ ذریعۂ معاش کے لیے بی۔ این کالج کے سامنے ایک شاندار دوکان نیشنل بیڈنگ اسٹور قائم کی۔ اپنے ساتھ اپنے چھوٹے بھائی کی بھی تربیت میں مشغول رہے۔ پٹنہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کے بعد وہیں لکچرر مقرر ہوئے۔

کلیم صاحب کی شعر و شاعری کا آغاز ۱۹۴۷ء سے ہوتا ہے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کی نظموں میں بڑی سادگی اور الفاظ بہت عام فہم ہوتے ہیں۔ اپنے ہلکے پھلکے اشاروں میں بڑی سے بڑی بات کہہ جاتے ہیں۔ آپ کی ایک قیمتی تصنیف "وہ جو شاعری کا سبب ہوا" بزمِ کاف پٹنہ کے تحت شائع ہو چکی ہے۔ اردو ادب میں آپ کے پسندیدہ شاعر مرزا غالب ہیں۔ جن کے اشعار اکثر و بیشتر پڑھتے رہتے ہیں۔

نمونۂ کلام یہ ہے ؎

ہنسیں نہ مجھ پہ وہی کہ جن کو شعور حالِ جنس نہیں ہے
میں چاک دامن جو پھر رہا ہوں یہ میرا دیوانہ پن نہیں ہے
خموش میں اس لئے نہیں ہوں کہ دولتِ فکر و فن نہیں ہے
بہت سخنہائے گفتنی ہیں مگر مجالِ سخن نہیں ہے
ہے مشورہ دوستوں کو میرا کہ کم نہ ہو گرمیِ تمنا
چراغ خلوت ہی میں بھلا ہو اگر کوئی انجمن نہیں ہے
زمانہ آئے تو دو جنوں کا ضرور کچھ دھجیاں اڑیں گی
قبائے رنگیں تو ہے کسی کی، اگر مرا پیرہن نہیں ہے
وہ جو شاعری کا سبب ہوا وہ معاملہ بھی عجب ہوا
میں غزل سناؤں ہوں اس لئے کہ زمانہ اسکو بھلا نہ دے

جمیل عظیم آبادی

عطاء الرحمٰن نام، المتخلص بہ جمیل، ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوئے۔ شہر عظیم آباد آپ کا وطن ہے۔ فارسی اور عربی کی تعلیم سے فارغ ہو کر پٹنہ سائنس کالج سے بی۔ ایس۔ سی کیا۔ ۱۹۴۸ء میں ڈھاکہ چلے گئے۔

آپ قدیم رنگ سخن کی حلاوت سے آشنا تھے۔ اور نئے رنگ و آہنگ کو بھی اپنے مزاج سخن میں سمو دیا۔ مطالعہ شعر و ادب وسیع رہا اور ذہانت و جودتِ طبع آپ میں بہت نمایاں رہی ہے۔ دراصل آپ نظم کے شاعر ہیں۔ جس کے تحت کئی پیاری نظمیں کہی ہیں۔ ان کی نظموں میں بڑی خوش آہنگ نئی نئی ترکیبیں نظر آتی ہیں۔ اس کے علاوہ جدت، تنوع اور ندرت

کے ساتھ ساتھ نئی فکر بھی ہے۔ نمونۂ کلام میں آپ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

اسی امید پہ جیتے ہیں تیرے کشتۂ ناز — کہ ایک روز تجھے شرمسار دیکھیں گے
یہ دنیا ہے یہاں پر آبگینہ ٹوٹ جاتا ہے — کہیں چھپتے پھرو آخر زمانہ ڈھونڈ ہی لے گا

فرید عمادی

سید شاہ فرید الحق نام، تخلص فرید عمادی خلف حضرت مولانا سید شاہ صبیح الحق عمادی مجیبی، سکونت خانقاہ عمادیہ منگل تالاب شہر عظیم آباد ہے۔ آپ کی پیدائش یکم جمادی الاوّل ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۲/ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو خانقاہ عمادیہ میں ہوئی۔ آپ کی تعلیمی لیاقت عالم، فاضل، منشی، منشی عالم، تجوید قرأت، بی۔ اتیچ۔ ای، اتیچ۔ ایم۔ ڈی (ہومیوپیتھ) اور ڈیپ اِن ایڈ (عربک اینڈ پرشئین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پٹنہ) ہے۔

موصوف کی ادبی زندگی کا آغاز دورِ متعلمی سے ہوتا ہے۔ شعر و سخن میں آپ نے اپنے ابتدائے کلام پر حضرت مبارک عظیم آبادی سے اصلاح لی۔ ان کے وصال کے بعد حضرت حمید عظیم آبادی سے شرف تلمذ حاصل رہا اصنافِ سخن میں غزل، سلام، منقبت، قطعہ، نعت اور مثنوی پر طبع آزمائی کی۔ لیکن نعت زیادہ کہا ہے اور اب صرف نعت ہی کہتے ہیں۔ شعر و سخن کے علاوہ نثر میں مضامین و مقالات بھی لکھے ہیں جو ادبی و مذہبی رسائل و اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اور پٹنہ ریڈیو سے بھی نشر ہوتے رہے ہیں۔ آپ کی مطبوعہ تصنیفات "حالات فخر زمان شہاب الدین پیر جگجوت رح، پچی درگاہ" اور "عربی کی پہلی کتاب" ہیں۔ آپ کے پسندیدہ شعراء

فارسی میں حافظ، عربی میں حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ اور اردو میں شاد عظیم آبادی ہیں۔ نمونۂ کلام میں نعت کے چند اشعار پیش ہیں ؎

رسول اللہ کو ہرگز نہ جزوِ کبریا کہئے
اگر کہئے تو ان کو سایۂ نورِ خدا کہئے

وہ قبلِ حضرتِ آدمؑ وہ بعدِ حضرتِ عیسیٰؑ
اُدھر بھی مصطفیٰ کہئے اِدھر بھی مصطفیٰ کہئے

خدا شیدا محمدؐ کا، محمدؐ اس کے شیدائی
اِدھر عشقِ نبیؐ کہئے اُدھر عشقِ خدا کہئے

نادم بلخی

نادم بلخی، عظیم آباد کے ایک ذی علم خاندان میں ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوئے جن کی ادبی خدمات کا ایک زمانہ معترف ہے۔ شاعری کا فن انھیں براہِ راست اپنے والد جناب فصیح الدین بلخی سے ورثہ میں ملا۔ جو ایک بلند پایہ محقق، تاریخ کا عروض داں اور صاحبِ کردار بزرگ تھے۔ "آغازِ سحر" آپ کے ادبی سفر کی ابتدا ہے۔ اور "ذوقِ سفر" آپ کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ درس و تدریس آپ کا محبوب مشغلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جی۔ ایل۔ اے کالج ڈالٹین گنج (پلاموں) میں شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے مصروفِ تعلیم و تدریس ہیں۔ آپ اردو، انگریزی، قدیم و جدید ادب و تنقید پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ شعر میں صنائع و بدائع، زبان و محاورات اور بالخصوص عروض میں عالمانہ بصیرت کے حامل ہیں۔ وہ نظم و نثر اور ان کی مختلف صنفوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

برگِ خزاں نہ بن کے رہ نخلِ بہار توڑ کر
پھولوں کا دائرہ بنا سرحدِ خار توڑ کر

گردِ سفر کو دیکھتے جو بھی سفر میں رہ گئے
ان کی نوا نہ بڑھ سکی زدِ غبار توڑ کر
باغ شہر میں گھس کے ہیں کتنے مریض منتظر
دوگے کسے کہو تنہا انار توڑ کر
اپنے تو منہ میں خاک ہے "دامنِ پشت" چاک ہے
تم بھی کھولا ہے کیا رسمِ وفا کو توڑ کر

ہاشم عظیم آبادی

ہاشم عظیم آبادی مولد و مسکن عظیم آباد۔ سکونت محلہ مہندرو پٹنہ۔ نثر اور نظم دونوں پر دسترس حاصل ہے۔ نثر میں انشائیہ اور نظم میں مزاحیہ نظم اور غزل کہتے ہیں۔ زیادہ حال باوجود کوشش کے نہ معلوم ہو سکا۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

نہ گر ابلیس نے اس طرح آدم کو ٹھگا ہوتا — تو کیوں بنتی یہ دنیا کیوں یہ ہنگامہ کھڑا ہوتا
جگہ اپنی نہ کرسی پر نہ مسند پر نہ منبر پر — ڈبویا مجھ کو پینے نے نہ پیتا میں تو کیا ہوتا
میاں مجنوں کو بھی لیلیٰ کے ابا جان نہ ٹھکراتے — تو وہ بیچارہ بی اے کر کے ڈپٹی ہو گیا ہوتا
کسی کے دستِ شفقت سے نہ ہوتی تم کو محرومی — تمہارا سر اگر اے ناصحِ مشفق گھٹا ہوتا
اگر لڑکوں کے بدلے لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوتیں
تو اب تک میں نہ دامادوں کے ہاتھوں لٹ گیا ہوتا

شہزاد معصومی

سید شہزاد حسن نام، شہزاد تخلص ابن سید آلِ حسن معصومی مرحوم، ریاستِ بہار کی بستی علی نگر پالی (ضلع گیا) کے رہنے والے ہیں۔ سکونت گوریا مٹھ، میٹھاپور پٹنہ۔ ۲۵ جنوری ۱۹۲۹ء کو اپنے وطن میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مولانا سید ذاکر حسین مرحوم سے وطن میں حاصل کی۔ آپ کے والد پٹنہ کالجیٹ اسکول میں ہڈ مولوی تھے۔ ۱۹۴۴ء میں اسی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اور راجندر کالج چھپرا سے ۱۹۴۶ء میں آئی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد پٹنہ کالج میں داخلہ لیا۔ ۱۹۴۹ء میں بی۔ اے فائنل میں تھے کہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو محکمۂ سینچائی سکریٹریٹ پٹنہ میں ملازمت کرلی۔ اور بی۔ اے کا امتحان نہ دے سکے۔ فی الحال آفس سپرنٹنڈنٹ ہیں آپ کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۹ء میں کالج کے دورانِ تعلیم سے ہوتا ہے۔ ابتدا سے ہی ترقی پسندانہ رجحانات نے ترقی پسند تحریک سے وابستہ کردیا۔ ۱۹۵۱-۵۲ء میں ترقی پسند مصنفین کی ریاستی پیمانہ پر تشکیل کے لئے جو لوگ ریاستِ بہار سے بلائے گئے، اس کے مندوبین شہزاد معصومی اور بدیع مشہدی تھے۔ آپ کی قیام گاہ لال باغ پٹنہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے اکثر و بیشتر جلسے ہوئے جس میں شہاب جعفری اور معصوم رضا راہی وغیرہ بھی شریک ہوئے۔

موصوف کا نظم و نثر دونوں اصناف سے تعلق ہے۔ نظم کی صنف میں ترقی پسند نظمیں، مرثیے، قصیدے، نعت، سلام اور نوحے